اسلام اور پاکستان

تاریخی، سیاسی، علمی اور ثقافتی پس منظر

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

اسلام اور پاکستان

تاریخی، سیاسی، علمی اور ثقافتی پس منظر

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:03-5869501

نام کتاب ——— اسلام اور پاکستان

طبع اوّل تا پنجم (جنوری 1983ء' تا ستمبر 1996ء) ——— 10,700

طبع ششم (اپریل 2005ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشرو اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت (اشاعت عام) ——— 35 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

پیشِ نظر مجموعہ میری چند تحریروں پر مشتمل ہے جو ۶۸۔۱۹۶۷ء کے دوران ماہنامہ میثاق 'لاہور میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھیں۔

ان میں میں نے ایک جانب تحریکِ پاکستان کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا ہے اور دوسری جانب موجودہ پاک و ہند مسلم معاشرے میں مذہبی فکر کے جو مختلف حلقے پائے جاتے ہیں اُن کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ــــــ لیکن میرے نزدیک ان کا اہم ترین گوشہ وہ ہے جس سے اُن عظیم غلطیوں کا سراغ ملتا ہے جن کے باعث ہم اس حد درجہ افسوس ناک صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اُس میں ثلث صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

اس ضمن میں لامحالہ بعض شخصیتوں اور جماعتوں کے کردار پر تنقید بھی آئی ہے جس کی زیادہ شدت کا ظہور فطری طور پر اُن ہی کے حق میں ہوا ہے جن سے احیاءِ اسلام اور اقامتِ دین کے ضمن میں سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں ــــ تاہم خدا گواہ ہے کہ اُن کی توہین و تنقیص نہ اُس وقت مقصود تھی جب یہ مضامین لکھے گئے تھے 'نہ آج مطلوب ہے' بلکہ اصل معاملہ تب بھی وہی تھا اور اب بھی وہی ہے جو غالبؔ کے اس شعر میں بیان ہوا کہ ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

پیش نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی اِن تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمدللہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں

حالات وواقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صدفی صد درست ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرزِ تعبیر اور اندازِ تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے' جو نہ ہوتی تو بہتر تھا ـــــ گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ـــ ممکن اس لئے نہیں کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بُنی ہوئی ہے' اور مناسب یا درست اس لئے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو اُن میں ردّوبدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے ـــ اگر صاحبِ تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہئے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ اُن کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدّت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا' جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی' لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔

میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبّین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں اُن سے بھی معافی حاصل کر لیتا ـــــ اس لئے کہ اُسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدّر یا رنج نہیں

ہے۔ (یہ اطلاع جناب عبدالرحیم' ڈپٹی چیف مکینیکل انجینئر' کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی محفل میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ: "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!" جس کی تائیدِ مزید مجھے بفلو میں مولانا کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ' ان کے الفاظ میں:۔ "...... ادھر اباجان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن......" ـــــ بہرحال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدانِ حشر میں جب میں اُن سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔

اِس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے طرزِ عمل کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیں اور اس میں نہ کسی کی محبت و عقیدت کو آڑے آنے دیں نہ کسی کے بغض و عداوت کو راہ پانے دیں' بلکہ یہ بے لاگ تجزیہ صرف مستقبل کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے ہو ـــ اور اس اعتبار سے انشاء اللہ العزیز قارئینِ کرام ان تحریروں کو مفید پائیں گے۔

خاکسار

ڈاکٹر اسرار احمد عفی عنہ

لاہور' یکم جنوری ۸۳ء

دیباچہ طبعِ سوم

یہ کتاب میری اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو ۶۸۔۱۹۶۷ء میں ماہنامہ 'میثاق' لاہور کے اداریوں کی حیثیت سے شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں محسوس ہوا کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر' اور اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع اور مربوط دستاویز کی صورت اختیار کرلی ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں انہیں پہلی بار کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اور کتاب کی مقبولیت کے باعث اگلے ہی سال اسے دوبارہ جوں کا توں طبع کرنے کی نوبت آگئی۔ اور اس بار بھی کتاب فوراً ہی ختم ہوگئی۔ چنانچہ ادھر کئی سال سے یہ نایاب تھی۔

اب طبع سوم کے موقع پر بھی کتاب تقریباً من و عن شائع کی جارہی ہے' سوائے اس کے کہ چند مقامات پر حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے' — اور سابق متن میں سے صرف ایک حاشیہ حذف کردیا گیا ہے — مزید بر آں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی ایک تحریر بطورِ ضمیمہ شامل کردی گئی ہے۔

انشاءاللہ یہ تحریریں پاکستان کے موجودہ سیاسی انتشار و خلفشار' اور تہذیبی و ثقافتی تصادم کے پس منظر کے لئے ایک آئینے کا کام دیں گی۔

خاکسار

اسرار احمد

لاہور۔ ۱۱ر اگست ۸۹ء

حصّہ اوّل

اسلام اور پاکستان

تاریخی اور سیاسی پس منظر

باب اوّل

تحریکِ پاکستان کا تاریخی پس منظر

اور اِس میں قومی و مذہبی عوامل کا تناسب

باب دوم

قیامِ پاکستان کے بعد مذہبی طبقات کا طرزِ عمل

ہونا کیا چاہیے تھا، ہُوا کیا ہے

باب سوم

سیاسی افراتفری سے ایوّبی آمریّت تک

جماعتِ اسلامی کا رقیبانہ کردار، اور
علماء کا معاندانہ رویّہ

باب چہارم

چند تلخ مگر سنگین حقائق

"اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!"

باب پنجم

دورِ ایوبی میں

حکومت اور مذہبی طبقات کے مابین تصادم

باب اوّل

تحریکِ پاکستان کا تاریخی پس منظر
اور اس میں
قومی و مذہبی عوامل کا تناسب

اگر کوئی یہ کہے کہ ــــــ "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا" ــــــ تو پورے ملک میں شاید کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکل سکے جو اس کی تردید کرے! ــــــ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ ــــــ "تحریکِ پاکستان کا اصل محرک مذہبی و دینی تھا ــــــ یا معاشی و معاشرتی؟" ــــــ تو اس کے جواب میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے!

حال ہی میں لاہور کے ایک انگریزی روزنامے [1] کے کالموں میں پاکستان کے ایک مشہور و معروف کالم نویس [2] نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:

> "تحریک پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ دراصل اس کے پیکر میں (برصغیر کے مسلمانوں کی) صرف قومی امنگوں کا اظہار ہوا تھا............"

بہت سے لوگوں کے نزدیک ان کالم نویس صاحب کی بات شاید اس لئے قابلِ توجہ نہ ہو کہ وہ 'حکومت کے ملازم' ہیں [3]، لیکن جہاں تک اس نظریئے کا تعلق ہے یہ صرف ان کا نہیں ہے بلکہ مرحوم حسین شہید سہروردی جو نہ صرف یہ کہ تحریک مسلم لیگ کے

---

[1] پاکستان ٹائمز

[2] مسٹر زیڈ۔ اے۔ سلہری

[3] واضح رہے کہ یہ تحریر مارچ ۱۹۶۷ء کی ہے۔

پرانے کارکن تھے بلکہ جنہیں بجاطور پر پاکستان میں حزبِ اختلاف کی علامت قرار دیا جاسکتا ہے ـــــــ اور جو یہاں پارلیمانی جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، بارہا ان سے کہیں زیادہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کر چکے ہیں ـــــــ اور حال ہی میں پاکستان کے ایک دوسرے بزرگ سیاست دان اور تحریک پاکستان کے پرانے کارکن جناب نور الامین نے بھی ایک ماہنامے کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نظریئے کی تائید کی ہے ـــــــ!

واقعہ یہ ہے کہ سوائے ان عوام النّاس کے جنہیں ان معاملات کا شعور ہی نہیں ہوتا یا اُن معدودے چند لوگوں کے جو صرف مذہب کے سہارے ملکی سیاست کے میدان میں داخل ہو جانے کی بنا پر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ـــــــ باقی جو شخص بھی غیر جانبداری کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرے گا وہ اس نظریئے کی صداقت سے انکار کی جرأت نہ کر سکے گا!

اللہ تعالیٰ حکیم اور علیم ہے ـــــــ اور اپنی حکمتوں کو وہی بہتر جانتا ہے تاہم بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی بھی بدقسمتی تھی اور شاید خود اسلام کی بھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک کو ابتداء ہی سے کچھ ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے نتیجے میں یہ روز بروز مذہب سے دور ہوتی چلی گئی۔

واضح رہے کہ برصغیر میں تحریکِ استخلاصِ وطن کے اوّلین داعی مسلمان تھے ـــــــ تحریکِ شہیدینؒ[۱] جہاں احیائے اسلام کی ایک ہمہ گیر تحریک اور منظّم کوشش تھی وہاں آزادیٔ وطن کو بھی اس کے مقاصد میں ایک اہم حیثیت حاصل تھی، گویا اس میں دین اور سیاست کا وہ حسین امتزاج موجود تھا جو ہماری تاریخ کے قرنِ اوّل کا طرّۂ امتیاز ہے۔

حادثہ بالاکوٹ (1831ء) کے بعد بھی تقریباً ربع صدی تک آزادیٔ وطن کی کوششوں میں اسی تحریکِ شہیدینؒ کے باقیات الصّالحات کی جلوہ آرائی نظر آتی ہے اور اسی کے متعلقین و متاثرین کہیں جیلوں میں تشدّد اور بہیمیت کے شکار بنتے اور کہیں پھانسی کے

---

[۱] مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ اور عظیم فلسفی و عالم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ۔

تختوں کو زینت بخشتے نظر آتے ہیں۔

اس پورے عرصے میں آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا!——— اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، ہندوؤں کے لئے انگریز کی غلامی ایسی نئی اور انوکھی بات نہ تھی اور ان کے لئے معاملہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی کا تھا——— جبکہ مسلمان حال ہی میں مسندِ حکومت سے اتر کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے تھے لہٰذا یہ بالکل فطری بات تھی کہ آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے ہوئی!

1857ء کے معرکۂ آزادیٔ وطن میں پہلی بار ہندوستان کے مسلمان اور غیر مسلم سب شانہ بشانہ اور دوش بدوش غیر ملکی استبداد کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ اس جنگِ آزادی کی اس اہم خصوصیت کے علاوہ کہ اس میں ہندو اور مسلمان یکساں طور پر شریک ہوئے، اس کی دوسری اور اہم تر خصوصیّت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کے سیاسی و عسکری زعماء کے ساتھ ساتھ ——— بلکہ بعض مقامات پر ان سے بھی بڑھ کر دینی و مذہبی پیشواؤں نے حصہ لیا——— اور علمائے کرام نے بھی سیف بدست اور سر بکف ہو کر جان کی بازی لگائی۔ جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء اور مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم۔

1857ء کے بعد تاریخ ایک بالکل نیا موڑ مڑ گئی!——— اور کمپنی بہادر کی حکومت کے اختتام اور براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیر انصرام آجانے کے بعد ہندوستان میں حالات نے ایک بالکل ہی دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ چنانچہ:

ایک طرف انگریزی استعمار نے اپنے پنجے جسدِ ہند پر مضبوطی سے گاڑ لئے اور اس کا سیاسی و عسکری تسلّط مستحکم ہو گیا——— نتیجۃً ہندوستانی روز بروز نہتّے اور عسکری اعتبار سے بے دست و پا ہوتے چلے گئے ——— اور آزادی کے لئے بھی بالکل غیر عسکری اور خالص آئینی و سیاسی جدّوجہد کا آغاز ہوا۔

اور اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کی عددی فوقیت کے نتائج و عواقب کا ظہور شروع ہو گیا———!

دوسری طرف خود انگریز نے تلوار کے بجائے قلم سے حکومت شروع کی اور ہندوستانیوں کو اُن کے اپنے ماضی سے منقطع، اپنے عقائدو افکارو نظریات سے دست بردار اور اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے علوم و فنون سے بیگانہ کرکے ایک نئے ہندوستان کی داغ بیل ڈالنی شروع کی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے اس "ثقافتی انقلاب" کا استقبال ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے مختلف طرز پر ہوا۔ ہندو اپنے ماضی سے پہلے ہی بہت دور نکل آئے تھے اور ان کا اپنے علوم و فنون اور اپنے تہذیب و تمدن سے کوئی گہرا رشتہ باقی نہ رہا تھا لہٰذا انہوں نے تقریباً یکسو اور متحد ہو کر نئے رجحانات کو خوش آمدید کہا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو ابھی اپنا شاندار ماضی پوری تابناکی کے ساتھ نظر آرہا تھا اور ان کے عقائد اور علوم و فنون ابھی ان کے قلوب و اذہان میں گہری جڑیں رکھتے تھے ـــــ لہٰذا ان کے ہاں ایک انتشار پیدا ہو گیا ـــــ مسلمانانِ ہند کے اُن طبقوں نے جو دین و مذہب سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے بدلتی ہوئی ہوا کے ساتھ اپنا رخ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا اور وہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر گوشوں اور کونوں میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسولؐ کے درس و تدریس میں منہمک ہو گئے ـــــ جب کہ ہندوستان کی مسلمان قوم کا سوادِ اعظم ـــــ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!" کے نظریئے کو اپنا کر نئے حالات کے مطابق بدلتا چلا گیا۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی توانائیاں منتشر ہو گئیں اور مجموعی طور پر ہندوستان کی مسلمان قوم کی قوت و طاقت کو ضعف پہنچا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی طبقے اور قومی قیادت میں بُعد پیدا ہو گیا جو بعد میں مسلسل بڑھتا چلا گیا اور اسے بجا طور پر دورِ جدید میں اسلامیانِ ہند کی قومی تحریک کی بدقسمتیوں کا سرِ آغاز کہا جا سکتا ہے۔

ساتھ ہی مندرجہ بالا دو اسباب کی بنا پر ـــــ یعنی ایک اس وجہ سے کہ خالص آئینی

جدّوجہد میں اکثریّت اور اقلیّت کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور دوسرے اس بناء پر کہ مسلمانوں کے مذہبی طبقات کے قوم کے سوادِ اعظم سے علیٰحدہ ہونے کی بناء پر ان کی مجموعی قوت میں کمی پیدا ہو گئی ——— ہندوستان میں غیر مسلموں کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہوا۔

اس میں مزید اضافہ غیر ملکی حکومت کی جانب سے غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کے ساتھ سرد مہری ہی نہیں بلکہ باقاعدہ ہمّت شکنی کی کوششوں سے ہوا۔ غیر ملکی حکمرانوں کا یہ رویّہ بھی بلاوجہ نہ تھا۔

اوّلاً انہیں خوب معلوم تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی ہے اور اس تازہ زخم خوردہ قوم کی خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں موجود ہیں جو کسی بھی وقت معمولی سی تحریک سے بھڑک سکتی ہیں۔

ثانیاً ہندو صرف ہندوستان میں تھے جبکہ ہندوستانی مسلمان اس عالمگیر اسلامی برادری کا جزو تھے جو کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے میں ایک غالب اکثریت میں تھی اور ابھی تک اس کے قلوب فاصلوں کے بُعد اور حالات و مسائل کے فرق کے باوجود کچھ ایک ہی سے احساسات و جذبات سے معمور اور ایک ہی سے نشے سے مخمور تھے ——— ! حتیٰ کہ صفحۂ ارضی کے بعید ترین گوشوں میں بسنے والے مسلمان ایک دوسرے کی تکالیف و مصائب پر ایسے تڑپ اٹھتے تھے جیسے خود ان ہی کے سینوں میں خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حسّاس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلمانوں پر مغربی استعمار اُس دور میں جو ستم ڈھا رہا تھا وہ اُس کے کرب و الم کو بری طرح محسوس کر رہے تھے اور اس کی بنا پر ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کے جذبات کو مزید انگیخت مل رہی تھی۔

ہندوستان کا ہندو غیر ملکی حکمرانوں کی نگاہ میں کچھ زیادہ ہی بے ضرر اور مسکین تھا چنانچہ ایک طرف خود اس نے نئے حکمرانوں کے ساتھ توافق و تعاون میں مسلمانوں پر پیش قدمی کی اور دوسری طرف غیر ملکی حکمرانوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ہندوستان کے

طول و عرض میں ہندو قوم میں ایک عام بیداری کی لہر دوڑ گئی اور وہ من حیث القوم ایک نئے جذبے اور نئی امید کے ساتھ قومی تعمیرِ نو کے کام میں منہمک ہو گئی —— ہندوؤں میں اس قومی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلمان دشمنی کے پرانے لیکن دبے ہوئے جذبات بھی ایک دم جاگ اٹھے۔

نتیجتہً انگریزی استعمار کے سائے میں ہندو امپریلزم نے انگڑائیاں لینی شروع کیں —— اور اس طرح ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے دورِ جدید کا آغاز ہو گیا!

یہ کشمکش ابتداء ہی سے بڑی شدید تھی اور پوری ہندو قوم میں مسلمانوں کی تقریباً آٹھ سو سالہ غلامی کا ردِّ عمل ایک دم پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا —— مسلمان قوم کے سوادِ اعظم نے اس ابھرتی ہوئی طاقت کے کچوکوں اور چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کے ہر میدان میں ہندوؤں نے منظم طریقے پر مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی اور ان کے نفرت بھرے تعصّب کا مظاہرہ ہر سمت ہونے لگا! —— یہی نہیں بلکہ ہندو امپریلزم کا یہ عفریت کچھ ایسے انداز اور جوش و خروش سے اٹھا کہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہندوستان کی پوری مسلم قومیت کو نگل کر بالکل نیست و نابود کر دے۔

یہ حالات تھے جن میں ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کی تحریک نے قوت پکڑنی شروع کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے قومی تشخص کے بقاء کی فکر دامن گیر ہوئی۔

بدقسمتی سے اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی طبقوں اور خصوصاً تحریکِ شہیدینؒ اور جماعتِ مجاہدین کے معنوی و روحانی وارثوں نے حالات کے رخ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی اور وہ ہندوستان کی پوری مسلمان قوم کے سوادِ اعظم کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے میں بری طرح ناکام رہے!!

اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل

سبب وہ حد سے بڑھی ہوئی انگریز دشمنی ہو جو ان کے لائے ہوئے زندقہ والحاد ــــــ اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر ان کے بے پناہ مظالم سے پیدا ہوئی تھی ــــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان حضرات کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہو جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سے نبٹ لینے کے بعد ابنائے وطن کے مقابلے میں اپنے دین اور اپنے تہذیب و تمدّن اور فی الجملہ اپنے قومی تشخّص کا تحفظ کچھ مشکل نہ ہو گا[1] ــــــ بہر حال ہوا یہ کہ ان حضرات نے اپنے لئے یہ راہ متعین کی کہ پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر غیر ملکی حکمرانوں سے گلو خلاصی کرالی جائے، ہندو مسلم معاملات اس کے بعد طے ہوتے رہیں گے۔ جبکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے یہ لائحۂ عمل طے کیا کہ وہ پہلے ہی سے تحفظّات کے حصول کی جدّوجہد کریں گے اور اس امر کی سعی کریں گے کہ وطن اس طور سے آزاد ہو کہ اس میں ان کے جملہ حقوق اور فی الجملہ ان کے قومی تشخّص کے تحفّظ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے۔

اس طرح ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم اور اس کے مذہبی طبقات کے مابین بُعد مزید بڑھ گیا ــــــ بلکہ آزادی کی جدّوجہد میں یہ دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ راہوں پر گامزن ہو گئے ــــــ! جوں جوں وقت گزرا یہ بُعد بڑھتا چلا گیا۔ اور بعد میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اس میں ضد کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ پھر شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں بھی رجالِ دین کی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہیں!

اس صورت حال کا سب سے اہم نتیجہ، جس کی جانب بہت کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے، یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک قوم کے بہترین افراد سے محروم ہو گئی۔ اب تک قوم کی پوری سیاسی و دینی قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس میں ایک سے

---

[1] اس کا ایک ممکن سبب یہ بھی ہے کہ معاش کے معاملے میں علماء کرام کا غیر مسلموں سے کوئی تصادم نہیں تھا۔ اس لیے کہ ان کی معیشت کا پورا دارو مدار مسلمانوں کے چندوں اور ان کی خیرات و صدقات پر تھا۔ جبکہ مسلمان عوام کو ہر میدان میں خواہ وہ سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں کا معاملہ ہو خواہ تجارت اور کاروبار کا ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے (ECONOMIC STRANGULATION) کی کوششوں کا بالفعل تجربہ ہو رہا تھا!

بڑھ کر ایک مخلص و بے نفس، محنتی و سخت کوش، آزمودہ و تجربہ کار، اور ہر اعتبار سے منجھا ہوا اور سرد و گرم چشیدہ سیاسی کارکن موجود تھا وہ قوم سے بے تعلق ہو کر رہ گیا ـــــــ (اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج خصوصاً پاکستان میں ہماری قومی زندگی جس شدید قحط الرجال سے دوچار ہے اس کا اصل سبب یہی نہیں ہے!)

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی سیاست مذہب سے جس تیزی سے دور ہوتی جارہی تھی اگر یہ بُعد اسی طرح بڑھتا رہتا تو بات نہ معلوم کہاں تک جا پہنچتی، لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ اُس دور میں چند شخصیتیں ایسی بھی ابھریں جنہوں نے اس بُعد کو کم کرنے کی کوشش کی ـــــــ اور اس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

اِن شخصیتوں میں سرِفہرست علامہ اقبال کا نام ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومی تحریک میں مذہبی جذبے اور رنگ کی آمیزش کی جو کامیاب کوشش کی وہ ظاہر و باہر ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ 'مذہبی' آدمی ہرگز نہ تھے لہٰذا ان کی کوششوں سے قومی تحریک میں کم از کم وقتی طور پر مذہبی روح تو ایک حد تک پیدا ہو گئی لیکن 'مذہبی طبقوں' سے اس کا بُعد کسی طرح کم نہ ہوا۔

علامہ کے ساتھ ہی ایک دوسری عظیم شخصیت جس نے ایک بار حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگا کر امّتِ مسلمہ کی "عمرِ رفتہ" کو آواز دی اور 'امام الہند' کا خطاب پایا وہ مولانا ابوالکلام مرحوم کی تھی اِنہوں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کی ولولہ انگیز دعوت کے ذریعے ایک بار اسلامیانِ ہند کے دل میں پھر سے قرونِ اُولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔ لیکن وہ بھی جلد ہی ـــــ جبکہ ابھی ان کی زوردار دعوت کی صدائے بازگشت خود ان کے اپنے کانوں تک بھی نہ پہنچ پائی تھی اس کام سے دستبردار ہو گئے ـــــــ تاہم ان کی دعوت سے بھی وقتی طور پر ایک دینی جذبہ ہندوستان کی پوری مسلم قوم میں تازہ ہو گیا۔

'امام الہند' کی دعوت کی گھن گرج کچھ کم ہوئی ہی تھی کہ ایک تیسری شخصیّت جسے ان ہی کی شخصیت کا معنوی تسلسل قرار دیا جاسکتا ہے انہیں ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کے عزائم کے ساتھ سامنے آئی ـــــــ یہ مولانا سید

ابو الاعلیٰ مودودی تھے! جو اگرچہ معروف 'مذہبی حلقوں' سے تو متعلق نہ تھے لیکن ان کی "مذہبیّت" بہرحال مسلّم تھی! انہوں نے ایک طرف ان 'مذہبی حلقوں' پر شدید تنقید کی جو ہندوستان کی اکثریت کے عزائم سے بے خبر، آزادی کی محبت اور انگریز دشمنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی راہ پر چل پڑے تھے جس کا نتیجہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیّت کا قیام اور اس میں مسلمانوں کی قومیّت کا کلّی انضمام تھا ــــ اس طرح ان کے قلم نے گویا پہلی بار مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم کے دلی احساسات کی ترجمانی مدلّل و مفصّل طور پر کی! چنانچہ قوم نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا ــــــ دوسری طرف انہوں نے اپنے مخصوص کلامی انداز میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دین کی طرف متوجہ کیا اور مغرب کے ملحدانہ افکار و نظریات کا پرزور ابطال کر کے اسلام کی حقّانیت اور خصوصاً اس کے ایک مکمل اور بہترین نظامِ حیات ہونے کو واضح کیا ــــ چنانچہ ان کی کوششوں سے ایک بڑی تعداد میں مسلمان نوجوان خصوصاً وہ جو انگریزی تعلیم یافتہ اور ــــــــ مغربی تہذیب و تمدّن کے دلدادہ تھے دین کی جانب راغب ہوئے ــــ اور ایک بار پھر یہ امید بندھی کہ ہندوستان کی مسلم قومیّت اور اسلام کا رشتہ از سرِ نو استوار اور مضبوط و محکم ہو جائے گا۔

لیکن جلد ہی یہ امید منقطع ہو گئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک دوسرے بڑے حادثے سے دوچار ہو گئی ــــــ یعنی مولانا مودودی مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ گئے اور ایک دوسری راہ پر گامزن ہو گئے۔

اپنے رخ کی اس تبدیلی کی جو دو بڑی وجوہات مولانا نے بیان فرمائیں وہ انہی کے الفاظ میں سنئے:

> "پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامۃ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدّت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقف

دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لئے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیٰحدہ وجود برقرار رکھا بھی جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کار فرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزو اتنا کم اور قوم پرستانہ جزو اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدِ کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ دیباچہ)

اگرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک مولانا مودودی کی مسلمانانِ ہند کی قومی جدّوجہد سے کنارہ کشی کا اصل سبب بالکل ذاتی تھا۔ چنانچہ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے متذکرہ صدر کالم نویس صاحب[1] تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مولانا نے تحریک پاکستان سے اپنی کنارہ کشی کا کبھی کوئی سبب بیان نہیں فرمایا (؟) لیکن اس کی وجہ بہرحال تھی اور بادنیٰ تأمّل جو بات معلوم ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا پرچار اس امید میں کیا تھا کہ وہ اپنی قیادت انہی کو سونپ دیں گے لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں نے جس شخص کی صدا پر کان دھراوہ بجائے ان کے قائداعظم تھے تو انہوں نے فوراً اس پورے نقشۂ کار ہی کو تج

---

[1] جناب زیڈ۔ اے۔ سلہری

دیا..... (گویا) مولانا مودودی کی غدّاری کا اصل سبب خالص ذاتی تھا ——— !"

لیکن اس وقت ہم اس بحث میں الجھنے کو سعئ لاحاصل سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک مولانا نے 41-40ء میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے کٹ کر اپنے لئے جو کام تجویز کیا ——— یعنی قومی سطح سے بلند اور گروہی مفادات سے بالا ہو کر خالصتہً اللہ کے دین کی دعوت اور تبلیغ واشاعت اور وہ بھی خالص علمی وفکری انداز میں ——— وہ یقیناً قومی جدوجہد کے مقابلے میں بہت اعلیٰ وارفع تھا۔

تاہم قومی جدّوجہد کے نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کے رخ کی یہ تبدیلی سخت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کے اسلام سے حقیقی ومعنوی بُعد میں مزید اضافہ ہو گیا بلکہ طبقۂ متوسط کے نہایت مخلص اور سرگرم کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی قومی جدوجہد سے لاتعلق ہو گئی۔

41ء سے 47ء تک کا عرصہ ہندوستانی سیاست میں حالات وواقعات کی انتہائی تیز رفتاری کا دور ہے' دوسری جنگِ عالمگیر کے بعد ایک[1] طرف خود انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک ہندوستان پر اپنا تسلّط برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ دوسری[2] طرف انڈین نیشنل کانگرس کے جھنڈے تلے ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے جدوجہدِ آزادی کو تیز تر کر دیا اور تیسری[3] طرف مسلمانانِ ہند کا سوادِ اعظم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مشغول ہو گیا۔

اس جدوجہد کے آخری زمانے میں جبکہ مسلم لیگ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بالکل واضح اور مبرہن کر دے کہ وہ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پوری مسلمان قوم یکسوئی کے ساتھ اس کے جھنڈے تلے جمع ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے دینی جذبات کو اپیل کرتی اور اسلام سے ان کی محبت اور دلی تعلق کو کام میں لاتی۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا ہندوستان "پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالٰہ الااللہ!" کے نعروں سے گونج اٹھا اور اسلامی

حکومت' اسلام کے اصولِ مساوات و اخوت ' اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی ' اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی قانون و دستور کی اصطلاحات کا استعمال مسلم لیگ کے رہنماؤں کی تقریروں میں عام ہو گیا۔ گویا اس دور میں تحریکِ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف قومی مفادات کی محافظ ہی نہیں بلکہ دین کے ساتھ ان کی محبت اور اسلام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا مظہر بھی بن گئی۔ چنانچہ پوری قوم مجتمع ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور خود مذہبی طبقات میں سے بھی کچھ لوگ اس کی امداد کے لئے میدان میں نکل آئے[۱]

تاہم یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ تحریکِ مسلم لیگ کا وہ دور تھا جس میں کسی تحریک کے واقعی نظریات اور حقیقی افکار کے بجائے خوش آئند جذبات اور نیک خواہشات[۲] کی عملداری ہوتی ہے اس دور کی کہی سنی باتوں پر کسی مستحکم تعمیر کا خیال باندھنا ایک بچکانہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

خود مولانا مودودی اس دور میں قومی زندگی کی منجدھار سے دور بیٹھے عمرانیات کے ان اٹل اصولوں کا درس دیتے رہے کہ:۔

"حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی 'نفسیاتی' تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے اس کے کچھ ابتدائی لوازم' کچھ اجتماعی محرکات' کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے یہ وجود میں آتی ہے............"

"...... اس خام خیالی[۳] کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو مگر خالص علمی طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی

---

۱ یعنی بریلوی مکتبِ فکر کے علماء و مشائخ کی اکثریت اور حلقۂ دیو بند سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اُن کے رفقاء کار اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعض دوسرے متوسلین۔

۲ یعنی رومانویت (ROMANTICISM)

۳ یعنی یہ امید کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہو گا۔

کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے...... "

"...... بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں...... "

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم: اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے)

اور پھر جوں جوں قومی تحریک زور پکڑتی اور پوری مسلمان قوم کو اپنے دامن میں سمیٹتی چلی گئی ان کی تنقیدیں بھی تلخ تر ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ ان میں نفرت و حقارت کی آمیزش بھی ہو گئی۔ چنانچہ اپریل 1947ء میں ٹونک میں انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ فرما دیا کہ:

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ "

اور "یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے...... "

(روداد جماعت اسلامی)

سارے ہندوستان کا پاکستان بننا تو تقدیر الٰہی میں نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم ہی سے ہوا کہ اگست 1947ء میں پاکستان جیسا کچھ بھی ہے عالمِ وجود میں آ گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام عمرانیات اور سیاسیات کے طالب علموں کے لئے ایک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک میں ابھی ہرگز اتنی قوت اور بل بوتہ نہ تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کی صورت میں ہندو امپیریلزم کے چنگھاڑتے ہوئے عفریت کی خواہشات کے علی الرغم اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے۔ کچھ لوگ اس میں انگریزوں کی سیاست کا دخل گردانتے ہیں لیکن کبھی ابتدائی دور میں چاہے تحریکِ مسلم لیگ پر کسی انگریز گورنر جنرل یا وائسرائے کی نظرِ کرم رہی ہو یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل ـــــ اور خصوصاً برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسرِ اقتدار آ جانے کے بعد انگریزی حکومت کا رویّہ مسلم لیگ کے ساتھ واضح طور پر

معاندانہ رہا ـــــ اور ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کے بارے میں تو سب کو یہ معلوم ہے کہ وہ کانگرس کے علانیہ طرف دار اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔

بنابریں اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا قیام اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مشیت تھی جو ہندوؤں اور انگریزوں کی متفقہ مخالفت کے علی الرغم پوری ہوئی تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے!

ہم نے اسلامیانِ ہند کی تقریباً سوا سو سالہ تاریخ کے ان چند اہم نقوش کو صفحہ قرطاس پر اس لئے منتقل کیا ہے کہ تحریک پاکستان کا صحیح پس منظر نگاہوں کے سامنے آ جائے اور صورتِ واقعہ جیسی کچھ کہ فی الحقیقت ہے ظاہر ہو جائے۔ اس لئے کہ صحیح طرز عمل اور درست سمت میں اقدام کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ نیک خواہشات کی عمل داری بسا اوقات انسان کے نقطۂ نظر کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے اور میدانِ سیاست میں اترنے کے بعد بارہا ایسا ہوا کہ ایک غلط موقف جو ابتداء میں محض "حکمت عملی" کے تحت اختیار کیا جاتا ہے، بعد میں جماعتوں اور تحریکوں کے اپنے نقطۂ نظر میں مستقل طور پر ایسی کجی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے جو پھر اس کے گلے کا ہار بن جاتی ہے اور کسی طور سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ نتیجتاً بالکل مخالف سمت میں سفر کے باوجود یہ توقع برقرار رکھی جاتی ہے کہ بس ؎

"اس موڑ سے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو ذرّا آتا جا!"

آئندہ صحبت میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم قیام پاکستان کے بعد کے بیس سالوں کا جائزہ اسی نقطۂ نظر سے لیں گے ـــــ اور پھر ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان دونوں کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا تعلق رکھنے والے لوگوں کو جو طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اسے بیان کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(میثاق' مارچ 1967ء۔ 'تذکرہ و تبصرہ')

☆ ☆ ☆

باب دوم

قیامِ پاکستان کے بعد
مذہبی طبقات کا طرزِ عمل
ہونا کیا چاہیے تھا، ہُوا کیا؟

('تذکرہ و تبصرہ' ___ 'میثاق' لاہور، اپریل ۶۷ء)

پاکستان کا قیام ہرگز ایک معمولی واقعہ نہ تھا ___ دنیا کے نقشے پر اس طرح اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا رونما ہو جانا یقیناً مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کسی بڑی تدبیر کے سلسلے کی کڑی تھا ___ اور اب ضرورت اس امر کی تھی کہ قوم کے تمام طبقات اسے ایک عطیۂ خداوندی اور نعمتِ خداداد سمجھتے اور ماضی کے تمام اختلافات کو بھلا کر کامل توافق و تعاون کے ساتھ اس کی تعمیر میں لگ جاتے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُس قومی قیادت پر جو اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی اور جس کے ہاتھوں میں اس کی حکومت کے تمام اختیارات آئے تھے اچانک بہت سی عظیم اور کٹھن ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں۔ اس کا فرض تھا کہ ایک طرف اس کے بقاو تحفظ اور دفاع و استحکام کا بندوبست کرتی اور اس کی انتظامی مشینری کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سرِ نو استوار کر کے تعمیری و ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد شروع کرتی ___ اور دوسری طرف قوم کی سیاسی تربیت کا ایسا بندوبست کرتی جس سے اس میں سیاسی شعور نشوونما پاتا، خیالات میں یک رنگی اور مقاصد میں ہم آہنگی پیدا ہوتی، قومی و ملی احساسات اجاگر ہوتے اور صحت مند سیاست کے خطوط متعین ہوتے چلے جاتے! ___ پاکستان کی بقا اور

تحفظ و ترقی کے لئے فوری طور پر اگرچہ مقدم الذکر کام اہم تر تھا ــــ لیکن دیرپا استحکام اور ٹھوس تعمیر کے نقطۂ نظر سے مؤخرالذکر کام کہیں زیادہ ضروری تھا!

مذہبی و نیم مذہبی طبقات کو' عام اس سے کہ پہلے وہ پاکستان کے شدید مخالف تھے یا بزعمِ خویش کسی عظیم تر منصوبے پر عمل پیرا رہے تھے' لازم تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کو قدرت کا اشارہ سمجھ کر آئندہ کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو بالکل تبدیل کر لیتے اور اسے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ بنانے کے لئے مثبت تعمیری جدوجہد میں بہ دل و جان مصروف ہو جاتے۔ اس کے لئے ایک طرف یہ ضروری تھا کہ ہر گروہ اپنے مزاج کی مناسبت اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے تناسب سے اس عظیم جدوجہد کے کسی ایک شعبے کو سنبھال لیتا اور دوسری طرف یہ لازمی تھا کہ انتشار و افتراق کے تمام رخنوں کو قطعی طور پر بند کر دیا جاتا اور قومی قیادت کے ساتھ حتی الامکان تعاون کی روش اختیار کی جاتی۔

وہ مذہبی حلقے جو جمعہ و جماعت' اور درس و خطابت کے ذریعے عوام سے قریب ترین ربط و تعلق رکھتے تھے اور ان میں گہرے اثر و نفوذ کے مالک تھے' مذہبی' اخلاقی اور روحانی اقدار کے احیاء کے لئے انتہائی مؤثر کام کر سکتے تھے ــــ اور جماعت اسلامی علمی و فکری سطح پر اسلامی انقلاب اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیاء کے لئے قیمتی خدمات سرانجام دے سکتی تھی۔

اس اعتبار سے جماعت اسلامی واقعۃً ایسی پوزیشن میں تھی کہ اپنے پیش نظر ہمہ گیر اور عالم گیر اسلامی انقلاب کے لئے قیامِ پاکستان کو ایک بہترین موقع کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ مولانا مودودی نے چھ سات سال مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد اور عام سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہ کر جو کام کیا تھا اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک ایسی جمعیت فراہم کر لی تھی جو ایک اچھی بھلی تعداد میں ایسے مخلص اور سرگرم اور ساتھ ہی نظم اور باقاعدگی اور سلیقے اور قرینے کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت سے مسلح کارکنوں پر مشتمل تھی جن میں کم از کم اسلام کو دنیا میں سربلند

> کرنے کی حد تک اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح شعور بھی موجود تھا اور اس کے لئے محنت و مشقت کے مادّے اور ایثار و قربانی کے جذبے کی بھی کمی نہ تھی۔

اور سب سے اہم یہ کہ اس جمعیت میں دین و دنیا اور قدیم و جدید کا وہ امتزاج بھی موجود تھا جو اس دور میں دین کی کسی بھی مؤثر خدمت کے لئے لازمی اور لابدی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جمعیت مسلمانوں کے جدّت پسند اور قدامت پرست طبقات کے مابین ایک 'امّتِ وسطیٰ' کا رول ادا کر سکتی تھی اور سراپا جامد مذہبیّت اور از سرتا پیر متحرک متجدّدیت کے درمیان 'سواء السبیل' کو واضح اور روشن کر سکتی تھی۔

کاش کہ قوم کے ان تینوں اہم طبقات میں بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کا شعور بروقت پیدا ہو جاتا اور وہ کامل توافق و تعاون کی فضا میں اپنے اپنے حصے کے کاموں میں منہمک ہو کر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے میں لگ جاتے ـــــ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا ـــــ!!

جہاں تک قومی قیادت کا تعلق ہے اگرچہ اس غریب پر قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی مختلف خارجی و داخلی اسباب کی بنا پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا چنانچہ ملکی بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کے کام تو جیسے کچھ اور جتنے کچھ اس سے بن آئے اس نے کئے لیکن سیاسی میدان میں قوم کی تنظیم و تربیت اور قومی شعور اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے کا کام وہ بالکل نہ کر پائی۔ تاہم جہاں تک تعاون و توافق کا تعلق ہے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ پاکستان کی پہلی قومی قیادت کی جانب سے اس سلسلے میں تنگ دلی اور بخل کا مظاہرہ قطعاً نہیں ہوا ـــــ اور اس کے باوجود کہ بعض مذہبی حلقوں نے کھلم کھلا قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور خود مولانا مودودیؒ بھی نہ صرف یہ کہ اس سے بالکل علیحدہ رہے تھے بلکہ تحریک پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام میں اس پر شدید اور بعض اوقات دلآزار قسم کی تنقیدیں بھی کرتے رہے تھے، تاہم اپنا وقت آنے اور قوت و اقتدار پر بلا شرکتِ غیرے قابض ہونے کے بعد اس نے نہ صرف یہ کہ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے متمتع اور مستفید ہونے کے معاملے میں مسلم لیگ کے حامیوں اور مخالفوں کے مابین فرق و امتیاز کا کوئی شائبہ بھی کبھی

پیدا نہ ہونے دیا ــــ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تعاون کے دروازے پوری طرح کھول دیئے جس کی روشن ترین مثال یہ ہے کہ خود مولانا مودودی کو اپنے خیالات کے اظہار اور اپنے نظریات کی اشاعت کے بھرپور مواقع نہ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بلکہ ریڈیو تک پر پوری وسعتِ قلب کے ساتھ مہیا کئے۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ایک قومی جماعت ہونے کی بنا پر مسلم لیگ کی صفوں میں ہر نقطۂ نظر اور مکتبۂ فکر کے لوگ پائے جاتے تھے، حتیٰ کہ خالص ملحد اور دہریے بھی موجود تھے ــــ لیکن پاکستان میں اس کی جو پہلی ٹیم برسرِاقتدار آئی اس میں مخلص قوم پرست مسلمان بلکہ خاصے مذہبی مزاج اور دینی مذاق کے لوگوں کو ایک فیصلہ کن پوزیشن حاصل تھی ــــــ!

اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہترین حکمت عملی یہ تھی کہ تمام دینی جماعتیں اور مذہبی حلقے پچھلے ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر کھلے دل کے ساتھ قومی قیادت کے ساتھ تعاون کی روش اختیار کرتے اور ایک طرف اپنی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں اور اخلاقی و عملی اصلاح کے کاموں میں مواقع اور مسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمانوں کی قومی ریاست میں حکومت کے ساتھ تعاون کی صورت میں متوقع تھا ــــ اور دوسری طرف قومی قیادت کے مخلص اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ کو مضبوط بناتے ــــ لیکن افسوس کہ صرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقائے کار کو چھوڑ کر کہ انہوں نے تو حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بھی مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا تھا اکثر مذہبی حلقوں نے یا تو لاتعلقی کی روش برقرار رکھی یا معاندانہ انداز اختیار کر لیا۔

فعال نیشنلسٹ علماء کی اکثریت اور ان کے اصل مراکز تو ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے۔ پاکستان کے حصے میں جو لوگ آئے ان میں سے مجلس احرار نے بظاہر بہت عقلمندی سے کام لیا اور سیاست کے میدان سے کامل کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی سرگرمیوں کو

صرف دینی ومذہبی دائرے میں محدود کر لیا لیکن ایک طویل عرصے تک کارزارِ سیاست میں گھمسان کی لڑائی لڑ چکنے والوں کے لئے کامل علیحدگی مشکل تھی چنانچہ چند ہی سال بعد ان کی 'محبوس سیاسیت' ایک آتش فشاں کے مانند پھٹ کر رہی اور پاکستان کی سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس حادثے نے پاکستان کی قومی وسیاسی زندگی کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے میں اہم ترین حصہ ادا کیا[۱] ——!

علمائے دین کی ایک عظیم اکثریت نے قومی وسیاسی زندگی سے ایک گونہ لاتعلقی کی اس روش کو برقرار رکھا جس پر وہ تقریباً پون صدی سے عمل پیرا تھے اور پاکستان آکر بھی وہ حسبِ سابق کلیتہً تعلیمی وتدریسی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ یہ تو ضرور ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی نئی اور عظیم دینی درسگاہیں پاکستان میں قائم ہو گئیں جن میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسولؐ کی صدائیں زور شور سے بلند ہونے لگیں اور اس اعتبار سے یقیناً ایک قابل قدر اور بیش قیمت کام سرانجام پا گیا—— لیکن یہ بھی بجائے خود ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت کے قلب ودماغ نے قیام پاکستان کے بعد حالات میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے کوئی اثر قبول نہ کیا—— اور نہ صرف یہ کہ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے قیام پاکستان کو کوئی اہم واقعہ سمجھ کر اس کے زیر اثر اپنے نقشۂ کار حتیٰ کہ اپنے تعلیمی وتدریسی معمولات یہاں تک کہ نصاب ہی میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہو بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ کہ حکومت کی باگ ڈور غیر ملکی اور غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمان قوم کے اپنے ہاتھ میں آگئی تھی، قطعاً کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ اپنے ذہنوں میں نئے مسلمان حکمرانوں کو بالکل اُسی مقام پر رکھ کر اپنے سابقہ طریقِ کار پر عمل پیرا رہے جس پر ان سے پہلے کے حکمران تھے[۲]۔

---

[۱] اشارہ ہے ۵۳-۵۲ء کی تحریک ختم نبوت کی جانب!

[۲] —— چنانچہ "شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا" کے مصداق اس حقیقتِ واقعی کی شہادت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی ایک تحریر میں موجود ہے جو اس کتاب کے ضمیمے کے طور پر شائع کی جارہی ہے!

بدقسمتی سے قومی قیادت کے بعض عناصر اور پاکستان کی مختلف سروسز کے اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے مغربی طرز فکر اور یورپی طرز بودوباش کو جس حد تک اختیار کرلیا تھا اس کے پیش نظر مذہبی طبقات کا یہ طرز عمل کسی حد تک فطری بھی تھا۔

بہرنوع ہوا یہ کہ قومی قیادت اور مذہبی حلقوں میں جو بُعد قیام پاکستان سے پہلے تھا وہ علیٰ حالہٖ قائم رہا ـــ اور اجنبیت اور غیریت کے پردے جوں کے توں حائل رہے۔ اور اگرچہ علماء کی ایک بڑی اکثریت نے اپنے آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دور ہی رکھا لیکن اس مغائرت اور بُعد کی بنا پر یہ بہرحال ہوا کہ عدم اطمینان کی ایک کیفیت ان میں مستقل طور پر موجود رہی جس سے مختلف سیاسی گروہ وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہے!

رہی جماعتِ اسلامی جو اِس دور میں احیائے اسلام کی سعی و جہد کے لئے سب سے زیادہ صلاحیت اور استعداد کی حامل تھی تو اس نے پاکستان میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اس داستان کا الم ناک ترین باب ہے اور اس کی بدولت اس کی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے تخریبی راستوں پر پڑ گئیں جن سے نہ صرف یہ کہ ملک و ملت کو شدید نقصان پہنچا بلکہ خود اسلام کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں!

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں مولانا مودودی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد سے یہ کہہ کر علیحدہ ہوئے تھے کہ محض نام کے مسلمانوں کی تنظیم سے اسلامی حکومت کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی' اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے علمی و فکری اور ذہنی و نظری سطح پر اسلامی انقلاب برپا کیا جائے اور پھر معاشرے میں اخلاقی و عملی تبدیلی اس حد تک پیدا کر دی جائے کہ اس میں کسی جاہلی نظام کا چلنا دشوار ہو جائے' حکومت اور ریاست کی سطح پر کسی واقعی اور پائیدار تبدیلی کی توقع اس کے بعد ہی کی جا سکتی ہے لہٰذا ہم مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا ساتھ دینے میں اپنا وقت ضائع اور اپنی منزل کھوٹی کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ اسی فطری طریق پر عمل پیرا ہو کر پہلے علمی و فکری ـــ اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کرنے کی سعی کریں گے ـــ چنانچہ

قومی تحریک سے علیحدہ ہو کر مولانا نے علمی و فکری سطح پر اسلام کی دعوت دینے اور جو لوگ اسے قبول کر کے اسلام کے اوامر و نواہی کے عملاً پابند ہوتے چلے گئے انہیں ایک تنظیم میں منسلک کرنے کا کام شروع کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا اپنے اسی طریق پر عمل پیرا رہتے اور جس قدر ممکن ہوتا اپنے اسی کام کی رفتار تیز تر کر دیتے اور اس کے ضمن میں مواقع و وسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو ایک مسلمان مملکت میں متوقع تھا اور جن کے ضمن میں جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں پاکستان کی پہلی قومی حکومت کی جانب سے ہرگز کسی بخل کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا!

لیکن افسوس کہ اس موقع پر ان کی ذہانت نے ایک بالکل ہی نیا پینترا بدلا۔ چنانچہ اچانک ان کے دل میں اپنی اس "قوم کا درد" اٹھا جس کی قومی جدوجہد کے دوران وہ ایک خاموش تماشائی ہی نہیں رہے تھے بلکہ دور کھڑے ہو کر طنز و استہزا کے تیر برساتے رہے تھے اور انہوں نے قوم کی حالتِ زار پر رحم کھاتے ہوئے اس کی 'سرپرستی' قبول فرمالی اور اس کی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ مولانا کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

> "......اس لئے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا، اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیر ہم آج تک کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنی ہو گی اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی و اجتماعی صلاح کے بغیر یک لخت با اختیار ہو گئی ہے......" (جماعت اسلامی، اس کی تاریخ، مقصد اور لائحہ عمل)

ساتھ ہی وہ ان مطالبات کے ساتھ سیاست کی عین منجدھار میں کود پڑے کہ:

(۱) چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصولِ پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی ــــ اور چونکہ یہی اس ملک کے نوسو ننانوے فی ہزار باشندوں کی دلی خواہش ہے لہٰذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی

دستور نافذ ہو اور شریعت اسلامی رائج کی جائے اور ——

(۲) چونکہ مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ مسندِ قیادت و سیاست سے دستبردار ہو جائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں! [۱]

اس طرح گویا مولانا مودودی نے احساس فرض سے مجبور ہو کر بیک وقت اسلام اور پاکستانی قوم دونوں کی سرپرستی کا بوجھ اپنے سر لے لیا!!

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کی قومی قیادت بہت سی داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا تھی۔ ایک طرف ایک بالکل نئی لیکن وسیع و عریض اور دو انتہائی دور دراز خطوں پر مشتمل سلطنت کے پیچیدہ مسائل و معاملات تھے جن کا حل اور وہ بھی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بجائے خود ایک کٹھن مرحلہ تھا' پھر اس پر تبادلۂ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مہیب مسائل مستزاد ہو گئے۔ دوسری طرف بانئ پاکستان اور ان کے دستِ راست قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تیسری طرف قومی تحریک میں مخلص' بے نفس اور تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے اور قومی کارکنوں کی ایک بڑی اکثریت الاٹ منٹوں کے چکر اور پرمٹوں اور لائسنسوں کے حصول یا قوت و اقتدار کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئی —— قومی قیادت کے مخلص عناصر ابھی اس صورت حال سے نپٹنے کی فکر کر ہی رہے تھے کہ مولانا مودودی اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر میدان میں آگئے اور انہوں نے پروپیگنڈے کی ایک مؤثر تکنیک سے ملک بھر میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ چنانچہ قومی قیادت ایک نئے اور پیچیدہ مسئلے سے دوچار ہو گئی!

قومی قیادت کے لئے اس مسئلے کی پیچیدگی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ جس اسلام کے نام پر مولانا مودودی سیاست کے میدان میں اترے تھے وہ نہ صرف یہ کہ خود ان کا اپنا دین تھا بلکہ

---

[۱] واضح رہے کہ یہ کوئی اقتباس نہیں ہے بلکہ جماعت اسلامی کے بعد از قیامِ پاکستان کے موقف کی مختصر ترجمانی ہے تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی تالیف "تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ"

قریبی زمانے میں خود اس نے اسی کے نام پر عوام کے جذبات کو اپیل کیا تھا ـــــ لہٰذا مولانا مودودی کے 'مطالبہ' کا کوئی براہ راست جواب اس کے لئے ممکن نہ تھا ـــــ دوسری طرف اسے یہ بھی نظر آرہا تھا کہ صورتِ حال ایسی بنادی گئی ہے کہ اسلام کی جانب کسی قدم کا اٹھانا مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی ' نئی قیادت ' کے سامنے پسپائی کے مترادف ہوگا۔ اس کا ایک بیّن ثبوت اُس وقت مل بھی گیا جب 'قراردادِ مقاصد' کو جو اصلاً خود تحریکِ مسلم لیگ کے مخلص اور دیندار عناصر (خصوصاً مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ وغیرہم) کی کوششوں سے منظور ہوئی تھی ' جماعت اسلامی نے اپنی ' فتح مبین ' قرار دے لیا! ـــــ لہٰذا قومی قیادت نے کچھ لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا ' کچھ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر ہیر پھیر کے راستوں سے حملے شروع کئے اور کبھی کبھی اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے کی براہ راست مخالفت بھی کی ـــــ اس معاملے میں پاکستان کی سیاست میں جو عجیب الجھاؤ پیدا ہوگیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قومی قیادت کی جانب سے اول اول جو لوگ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف دلائل و براہین کے ہتھیار لے کر میدان میں اترے وہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب جیسے پابندِ صوم و صلوٰۃ اور دینی درد اور مذہبی جذبہ رکھنے والے لوگ تھے[۱] ـــــ !

گویا جن لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے میں ملک و ملّت اور دین و مذہب دونوں کی بھلائی تھی غلط حکمتِ عملی کی بنا پر انہی کو دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا گیا ـــــ !! اور اسلام کو سیاسی میدان کا ایک مسئلہ بنا کر اسے اپنے بہترین بہی خواہوں کی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ـــــ !!

کاش کہ مولانا مودودی سمجھ سکتے کہ انہوں نے اس طریقِ کار کو اختیار کر کے اسلام کی

---

[۱] بعد میں اس صف میں ایک اہم اضافہ مسٹر اے کے بروہی کا ہوا جنہوں نے اُس شخص کو انعام دینے کا اعلان کیا جو ثابت کر دے کہ قرآن مجید میں کسی دستورِ ملکی کا خاکہ موجود ہے!

راہ میں کیسے کانٹے بودیئے تھے!

'مذہبی سیاست' کے اس میدان میں اولاً مولانا مودودی نے تنہا اپنے اور اپنی جمعیت کے زورِ بازو کے بل پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ دوسرے دینی حلقوں کی مدد اور تعاون کے بغیر کامیابی مشکل ہے چنانچہ انہوں نے وقتاً فوقتاً علمائے دین کا اشتراک و تعاون حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ کبھی انہیں اپنے پیچھے لگا کر اور کبھی حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ان کے پیچھے لگ کر (جیسا کہ اینٹی قادیانی تحریک کے زمانے میں ہوا) ایک 'دینی کیمپ' کا تصور پیدا کیا — اس کے دو انتہائی مضر نتائج بر آمد ہوئے: ایک[1] یہ کہ سیاست کے میدان میں جماعت اسلامی کے ساتھ علمائے دین بھی قومی قیادت کے حریف بن گئے اور رفتہ رفتہ بر سر اقتدار طبقہ اور 'رجالِ دین' دو مخالف و معاند گروہوں کی صورت اختیار کرتے چلے گئے — اور دوسرے[2] یہ کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو جدت پسندی اور از سرتا پیر متحرک متجددیت — اور قدامت پرستی اور سراپا جامد مذہبیت کے مابین ایک 'اُمّتِ وسطیٰ' کی پوزیشن کو ترک کر کے کلیتہً قدامت پرستی اختیار کرنی پڑی اور اگرچہ اس کی بنا پر بہت سے دلچسپ تضادات ظہور میں آئے مثلاً یہ کہ اُس شخص کو جو تنہا اپنی ذات پر بھی فقہِ حنفی کو پوری طرح نافذ کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اس میں اپنا 'اقول' لگانا ضروری خیال کرتا تھا یہ موقف اختیار کرنا پڑا کہ دس گیارہ کروڑ افراد کی ایک پوری قوم پر صدیوں پیشتر کی مرتب شدہ فقہ حنفی کو جوں کا توں نافذ کر دیا جائے![1] لیکن مولانا پر جلد از جلد مسندِ حکومت پر پہنچ کر 'قوم' اور 'مذہب' دونوں کو 'سنبھالنے' کا جو خبط سوار ہو گیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ قربانیاں بہرحال بہت حقیر تھیں۔ ع

ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر!

---

[1] اسی سلسلے کا ایک دلچسپ لطیفہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے سنایا کہ ایک موقع پر علماء کے ایک مشترکہ بیان پر مولانا مودودی نے ان سے بھی دستخط کرانے چاہے جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کی جائے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے فرمایا "اس پر میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے قتل کے حکم نامے پر میں خود دستخط کروں"۔

باب سوم

سیاسی افراتفری سے ایوّبی آمرّیت تک

جماعتِ اسلامی کا رقیبانہ کردار اور علماء کا معاندانہ طرزِ عمل

(تذکرہ و تبصرہ — 'میثاق' لاہور مئی ۶۷ء)

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' پاکستان کی قومی قیادت پر عالمِ نزع تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی طاری ہو گیا تھا اور وہ خود اپنے داخلی انتشار کی بناء پر' جو بیک وقت نظریاتی بھی تھا اور اخلاقی بھی' ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اس پر رہی سہی کسر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تند و تلخ تنقیدوں اور عوام کے مذہبی جذبات کے اشتعال نے پوری کر دی اور قیامِ پاکستان کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر وہ مسلم لیگ جو اس کے قیام کا ذریعہ بنی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

ختم تو مسلم لیگ از خود بھی ہو ہی جاتی لیکن مولانا مودودی نے مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کے عین عروج کے موقع پر اس سے علیحدگی اختیار کر کے قوم کے ساتھ جس ' ہمدردی ' اور ' خیر خواہی ' کا ثبوت دیا تھا اسی کا لازمی تقاضا غالباً یہ بھی تھا کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد وہ اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر مسلم لیگ کی سرکوبی کے لئے میدان میں آ جاتے اور اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے میں بھی بنفسِ نفیس شرکت فرماتے! —!

لطف کی بات یہ ہے کہ اُس وقت کی علیحدگی کے لئے تو یہ وجہ جواز پیش کی گئی تھی کہ اسلام کسی بھی ' قوم پرستی ' کو جائز نہیں ٹھہراتا خواہ وہ ' مسلم قوم پرستی ' ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن بعد از تقسیم 'لیگ دشمنی' اور 'قیادت کُشی' کے لئے خود بے تکلف مسلم قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا گیا اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار اور پاکستانی قوم کے سب سے بڑے وکیل بن کر قومی قیادت کا محاسبہ شروع کر دیا گیا[1]!

مولانا کی ذہانت نے یہ اندازہ تو ٹھیک ہی کیا تھا کہ مسلم لیگ کی دم توڑتی ہوئی قیادت پر کاری ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ لیکن آئندہ کے بارے میں جو توقعات انہوں نے قائم کی تھیں وہ نرے سہانے خواب ثابت ہوئیں اور قومی قیادت کے میدان سے ہٹنے پر بجائے اس کے کہ جماعت اسلامی کی 'نئی' قیادت کے لئے جگہ خالی ہوتی 'اُلٹا پُرانا' یونینسٹ اور کانگرسی ذہن میدانِ سیاست پر قابض ہو گیا[2] اور اس نظریۂ پاکستان ہی کی جڑیں کھدنی شروع ہو گئیں جس پر بعد از تقسیم خود مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے سیاسی موقف کی بنیاد رکھ دی تھی —— دوسری طرف تحریکِ مسلم لیگ نے وقتی طور پر قومی و ملی احساسات کا جو تھوڑا بہت رنگ عوامی طرز فکر پر چڑھا دیا تھا اس کے پھیکے پڑتے ہی خالص مفاد پرستی، کنبہ و قبیلہ پروری اور اقربا نوازی کا دور دورہ ہو گیا اور سیاست کے میدان میں بدترین جوڑ توڑ اور سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔

میدان سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی۔

تا آنکہ 1958ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک[1] طرف حکومت کا پورا نظم و نسق سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری[2] طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کی جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوئے تھے —— گویا پاکستان کی عوامی

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھئے "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ"

[2] اشارہ ہے ری پبلکن پارٹی اور اس کی حکومت کی جانب!

سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی!

ملّی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال یقیناً نہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محبّ وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہئے لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملّی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورتِ حال کی ذمّہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بےبصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا!—— ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے، نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے——! اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

1951ء میں جبکہ مرحوم مسلم لیگ ابھی موت اور زندگی کی کشمکش ہی میں مبتلا تھی، سابق صوبہ پنجاب[1] کے انتخابات میں مولانا مودودی بڑی خود اعتمادی اور آن بان کے ساتھ اور بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ کر کے انتہائی بلند و بالا اصولوں کے تحت شریک ہوئے—— اگرچہ اس موقع پر اس 'قوم' نے جس کی سرپرستی انہوں نے از راہِ نوازش اپنے سابقہ موقف کے سارے تانے بانے کی قربانی دے کر اختیار کی تھی، انہیں

---

[1] واضح رہے کہ اس تحریر کی اشاعت کے وقت مغربی پاکستان میں 'ون یونٹ' کا نظام قائم تھا۔

ایک ایسی دولتی رسید کی جس سے کم از کم ایک بار تو قیادت و سیادت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تاہم اس اصول کے تحت کہ ع

"پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!"

وہ اپنے اصولوں میں مسلسل کانٹ چھانٹ اور طریق کار میں متواتر کتر بیونت کر کے انتخابات میں شریک ہوتے رہے لیکن نتیجہ ہر بار الٹا ہی نکلا اور مسندِ حکومت واقتدار "نظراں توں نیڑے" ہونے کے باوجود روز بروز "قدماں توں دور" ہوتی چلی گئی۔[1]

تاہم درمیانی عرصے میں جب پاکستان کی سیاست کا میدان مسلسل اکھاڑ پچھاڑ اور ری پبلکن پارٹی، عوامی لیگ اور دوسرے بے شمار نئے اور پرانے سیاسی دھڑوں کی رسّہ کشی اور جوڑ توڑ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، آئے دن حکومتیں بن اور بگڑ رہی تھیں اور پوری پاکستانی قوم کی تقدیریں صبح و شام بدل رہی تھیں، دھندلی سی ایک امید اس بات کی قائم تھی کہ قلزمِ سیاست کے کسی اتار چڑھاؤ اور مدّوجزر کے دوران کیا عجب کہ اتفاقی واقعات و حوادث کا کوئی ریلا 'نئی اسلامی قیاوت' کی ایک بار ایوانِ حکومت تک رسائی کی صورت پیدا کر دے۔ پھر اپنی تنظیمی قوت کے بل پر مزید ترقی واستحکام کی صورتیں پیدا کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا ـــــ چنانچہ اس زمانے میں اپنی ایک تحریر میں مولانا مودودی نے افتراق وانتشار کے "شگاف" کو 'خیر کی راہ' قرار دیا اور اپنے کچھ مایوس معتقدین کی ہمت یہ کہہ کر باندھنے

---

[1] جماعتِ اسلامی کے حلقے کے پنجابی زبان کے مشہور شاعر عبداللہ شاکر نے انتخاباتِ پنجاب ۱۹۵۱ء کے موقع پر ایک نظم کہی تھی جو مرحوم 'تسنیم' کے انتخابات نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کو ہدفِ طنز و استہزا بنا کر ان کی شان میں بار بار یہ شعر دہرایا گیا تھا کہ ؎

"وزارت پنجابے والی لیئنی ضرور ہے　　نظراں توں نیڑے نیڑے قدماں توں دور ہے!"

محض یہ ایک شعر اس بچگانہ خود اعتمادی کی پوری تصویر کشی کر دیتا ہے جو اُس وقت جماعتِ اسلامی کے پورے حلقے پر طاری تھی ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ع

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا!"

چنانچہ انتخابات کے بعد میاں صاحب موصوف ہی وزارتِ علیا کے منصب پر فائز ہوئے۔ اور جماعت جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

کی کوشش کی :-

"حقیقت میں یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کے دلوں میں نفاق ڈال کر انہیں آپس میں لڑا دیا ہے۔ خیر کی راہ اب تک اسی شگاف سے نکلی ہے اور آئندہ بھی یہ شگاف جتنا وسیع ہوتا جائے گا خیر کا راستہ بھی کشادہ ہوتا چلا جائے گا............"

(ترجمان القرآن، مئی 56ء : اشارات)

اس اعتبار سے 58ء کا انقلاب 'خیر کی جملہ راہوں' کو ایک بارگی مسدود کرنے کا سبب بن گیا اور دُور افق پر امید کی جو کرن نظر آیا کرتی تھی دفعۃً وہ بھی معدوم ہو گئی ——— ! میدان سیاست کی ان پے درپے ناکامیوں سے مولانا مودودی پر شکست خوردہ ذہنیت اور رقیبانہ جذبات کا تسلط ہوتا چلا گیا اور نہ صرف ان کے اور ان کی جماعت کے بلکہ ان کے زیر اثر ایک بہت بڑے حلقے کے لوگوں کے اعصاب میں دائمی جھنجلاہٹ اور فکرو نظر میں مستقل کجی پیدا ہوتی چلی گئی۔ نتیجۃً قوم کے طبقۂ متوسط کے ایک بہت بڑے حلقے کے لوگوں کا حال یہ ہو گیا کہ ایک طرف تو توازن واستحکام کی حالت میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور ملک کے طول وعرض سے کسی بھی قسم کے انتشار واختلال کی خبر سے ان کے دل کی کلی کِھل اٹھتی ہے اور دوسری طرف ہر وہ شخص جو کسی وقت لیلائے اقتدار سے ہم آغوش ہو انہیں سراپا برائی اور مجسم شر ہی نہیں بلکہ تمام خرابیوں کا منبع اور ملک وملت کے سارے مسائل اور تمام مشکلات کا واحد سبب نظر آنے لگتا ہے اور جو کسی بھی ٹوٹی پھوٹی حزبِ مخالف سے تعلق رکھتا ہو قطع نظر اس سے کہ وہ خود ان کے نقطہ نظر سے ملک وملت اور مذہب ودین دونوں کے لئے کتنی ہی مضر و مہلک ہو وہ خیرِ کُل نہ سہی جزوی خیر بہرحال بن جاتا ہے ——— ! یہی وہ طرز فکر ہے جس کے تحت مولانا مودودی ایسے بظاہر ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک اور متحمل مزاج وبردبار انسان کے منہ سے ایسے غیر متوازن جملے نکلتے ہیں کہ :

"ایک طرف ایک مرد ہے جس میں سوائے اس کے کہ وہ مرد ہے اور کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں سوائے اس کے کہ وہ عورت ہے اور کوئی عیب نہیں [۱] ——— !" یا یہ کہ کنونشن لیگ کی جانب سے اگر کوئی فرشتہ بھی انتخابات میں کھڑا ہو

---

[۱] مولانا مرحوم نے یہ الفاظ صدر ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کے تقابل کے ضمن میں کہے تھے !!

گالو ہم اس کی بھی مخالفت کریں گے!" وغیرہ وغیرہ

جذبۂ رقابت کی یہ فراوانی ــــ بلکہ طغیانی اس صورت میں بھی مضر ہوتی اگر مولانا صرف ایک سیاسی لیڈر ہوتے۔ لیکن ان کی اس حیثیت نے کہ وہ ایک دینی جماعت کے سربراہ اعلیٰ اور خصوصاً سیاست کے میدان میں اسلام کے تنہا اجارہ دار بھی ہیں[1]، اس صورت حال کو اسلام کے لئے سخت خطرناک بنا کر رکھ دیا ہے!!

جس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس امر سے ہو گیا ہے کہ اگرچہ ادھر ایک عرصے سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا کوئی باقاعدہ ربط و ضبط علماء کے ساتھ نہیں ہے اور اب غالباً وہ اپنے سیاسی حوصلوں کی تکمیل کے لئے علماء سے اتحاد کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتے بلکہ اس کے برعکس ایک عرصہ سے ان کی ساری نشست و برخاست ان خالص سیاسی لوگوں کے ساتھ ہے جن کی ایک عظیم اکثریت کو (الا ماشاء اللہ) دین و مذہب سے عملی لگاؤ تو دور رہا کوئی لفظی و قولی مناسبت بھی نہیں ہے[2] ــــ تاہم یہ ایک امر واقعی ہے کہ ایک طرف مولانا اور جماعت اسلامی علماء کرام کی 'جدید تعلیم یافتہ طبقے اور خصوصاً اس کی مغرب پرستانہ ثقافت اور طرز بود و باش سے 'بیزاری کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف علمأ کرام بھی خالص دینی اعتبار سے خود مولانا سے شدید بیزار ہونے اور ان کے بعض نظریات کو شدید نوعیت کی ضلالت و گمراہی سمجھنے کے باوجود سیاسی میدان میں ان کے مذہبی رول کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں ــــ بلکہ ان کے ایک طبقے نے تو گویا اس معاملے میں جماعت اسلامی کی بے ضابطہ قیادت کو عملاً قبول کر لیا ہے ــــ اس طرح اگرچہ اس وقت کوئی باقاعدہ مذہبی کیمپ یا دینی محاذ تو موجود نہیں ہے تاہم مختلف دینی حلقوں اور مذہبی طبقوں کے مابین اتحاد و اتفاق کے مظاہرے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں[3] اس اعتبار سے تو بہت خوش آئند نظر آتے ہیں کہ ان میں اتحاد و اتفاق کی جھلک نظر آتی ہے

---

[1] واضح رہے یہ تحریر ۱۹۶۷ء کی ہے!

[2] جیسے مرحوم حسین شہید سہروردی وغیرہ۔

[3] جیسے مثلاً ایک عید الفطر ۶۷ء کے موقع پر اور دوسرے ۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف۔

لیکن چونکہ اس اتحاد کی بنیاد کسی مثبت تعمیری جذبے کے بجائے خالص منفی طرزِ فکر پر ہے لہٰذا در حقیقت اسلام اور پاکستان میں اس کے مستقبل کے نقطہ نظر سے نہ صرف یہ کہ اس میں افادیت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ الٹا مضرّت و نقصان کا شدید احتمال موجود ہے! اور یہ بات ہر اُس شخص کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے جو پاکستان میں اسلام کے مستقبل سے مخلصانہ دلچسپی رکھتا ہو کہ علمائے کرام کے ایک طبقے کا عمومی عدم اطمینان اور منفی طرزِ عمل اور جماعت اسلامی کی مستقل رقیبانہ جذبات کے ساتھ سیاست کے میدان میں اسلام کی 'سرپرستی' سے اس ملک میں اسلام کا مستقبل مخدوش ہوتا چلا جا رہا ہے! ——

☆ ☆ ☆

باب چہارم

کچھ تلخ مگر سنگین حقائق

؎ "رکھیو غالبؔ مجھے اِس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دِل میں سوا ہوتا ہے!"

(تذکرہ و تبصرہ ——— 'میثاق' لاہور مئی ۶۷ء)

واقعات و حقائق کا صحیح ادراک و شعور صحیح طرزِ عمل کے لئے بمنزلۂ اساس اور درست سمت میں اقدام کیلئے ناگزیر ولابدّی ہے۔ پاکستان کا اسلام کے نام پر حاصل کیا جانا چاہے کیسے ہی عظیم مسلّمات میں سے ہو' یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل اور ناقابلِ تردید ہے کہ یہ اُن مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہوا ہے جو بقول مولانا مودودی "صدیوں کے توارث کی بدولت" ایک قوم بن گئے ہیں اور جن کی قومیت کی اساس اگرچہ اسلام ہی پر ہے...... لیکن خود اسلام سے ان کا رشتہ و تعلق محض نسلاً متوارث ہونے والے 'مذہب' سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور جن کی اخلاقی حالت کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے جتنی آج سے تیس سال قبل درست تھی' نہ صرف یہ کہ اتنی ہی بلکہ شومئ قسمت سے اس سے بھی کہیں زیادہ آج صحیح ہے:۔

"......یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں' غالباً اُسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت' چوری' زنا' جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ کسی سے کم نہیں ہے............" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش مصنفہ مولانا مودودی)

دین کے ساتھ اس کے حقیقی لگاؤ کا جائزہ لینا ہو تو اولاً عوام کو دیکھئے کہ ان کی ایک عظیم اکثریت اس سے ایک سطحی سی محبت رکھنے کے سوانہ اس سے کوئی ذہنی مناسبت رکھتی ہے نہ عملی تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کیلئے محضر ناموں پر دستخط کرنے کیلئے تو یہ ہر وقت تیار ہوتے ہیں، لیکن اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کا معاملہ آجائے تو اسلام کے بڑے سے بڑے احکام کو پسِ پشت ڈال دینا اور اس کی تمام حدود کو پھلانگ جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

پھر چونکہ اس ملک کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بہرصورت یہی عوام ہیں، لہٰذا سیاست کے میدان میں اسلام کا نام خواہ کتنا بھی لیا جاتا ہو اور اس کے کیسے ہی بلند نعرے لگائے جاتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ اصل سکہ یہاں یا خالص سیاسی مفاد کا چلتا ہے یا برادریوں اور قبیلوں کی اقتدار طلبی ورسہ کشی کا!

پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کو دیکھئے جو کسی بھی اجتماعیت کا اصل قوام ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اعتقادات سے ان کے قلوب واذہان یکسر خالی ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی ایک بہت بڑی اکثریت مغرب کے مادہ پرستانہ الحاد کے نظریات وافکار پر پورا ایمان رکھتی ہے۔ ان میں سے جو جتنا ذہین ہے اتنا ہی مغربی فلسفہ وفکر سے متاثر ہے اور جو ذرا جری بھی ہے وہ اس کے برملا اعلان اور کھلم کھلا اعتراف میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا!

پھر چونکہ ان ہی میں سے ملک کی پوری انتظامی مشینری کے کل پرزے نکلتے ہیں اور ان کے نسبتاً ذہین تر افراد ہی سے ملک کے تمام فوجی وسول محکموں کا اصل تانا بانا بنتا ہے، لہٰذا فطری طور پر سروسز کا پورا ماحول (الا ماشاءاللہ) مغربی افکار ونظریات اور مادّہ پرستانہ وملحدانہ تہذیب وثقافت سے تیار ہوا ہے اور فطری طور پر ان میں سے زیادہ جری اور نسبتاً "تناقض ونفاق" سے آزاد لوگ اسی ثقافت کی پورے ملک میں ترویج واشاعت کی کھلم کھلا کوشش میں بھی مصروف ہیں!

ان لوگوں کو "مٹھی بھر" اور "گنتی کے چند لوگ" قرار دے کر ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش ایک سادہ سی خود فریبی ہے اور اس سے یہ حقیقت مٹ نہیں جاتی کہ اس

ملک کی 'ذہین اقلیت' (INTELLECTUAL MINORITY) بہر حال یہی ہیں اور ان ہی کے ہاتھ میں اس ملک کی اصل زمام کار ہے۔

اور آگے چلئے ـــــ اور حقائق کا مواجہہ کرنے کی جرأت پیدا کر کے جائزہ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ مغربی افکار و نظریات کا یہ استیلاء خود ان لوگوں کی بھی اکثریت کے ذہنوں پر بتمام و کمال موجود ہے جو یہاں اسلام کے علمبردار اور اسلامی نظام کے قیام کے داعی ہیں۔ ان کی عملی زندگیوں کے عام نقشے اور قول و فعل کے تضاد کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان کے تصوّرِ دین کا بنظرِ غائر مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود مذہب کا ایک خالص لادینی تصوّر ان کے ذہنوں میں قائم ہے اور اسلام ان کے نزدیک "ایک بہترین ضابطۂ حیات" اور "حیاتِ دنیوی کے مسائل کا بہترین حل" سے زیادہ اور کچھ نہیں! حقیقتِ دینی اور روحِ ایمانی سے ان کی ایک بہت بڑی اکثریت تہی دستِ محض ہے اور اسلام کے بنیادی اعتقادات کو ماننا ان کے نزدیک دراصل صرف کچھ سماجی و تمدنی ضرورتوں کی بناء پر ہے! ان کی حقیقت کا ادراک تو بہت دور کی بات ہے، اس کی کسی ضرورت کا احساس تک ان کو حاصل نہیں۔ دین جس زندگی کو اصلِ حیات قرار دیتا ہے' اس کی اہمیت ان کے نزدیک ایک تتمے سے زیادہ نہیں اور حیات دنیوی' جس کی دین میں کوئی وقعت نہیں وہ ان کے غور و فکر کا اصل موضوع اور ان کی سعی و جہد کا اصل مرکز و محور ہے! حتیٰ کہ جو چیزیں دین میں 'عماد' کا درجہ رکھتی ہیں' ان سے بھی ان کا شغف بس واجبی سا ہے ـــــ اور وہ بھی بایدو شاید ـــــ حد یہ ہے کہ ایک ثقہ راوی کی روایت کے مطابق ایک بہت بڑے داعیٔ دین اور علمبردارِ اسلام کے نزدیک:۔

"اسلام دراصل ایک سیاسی و تمدنی نظام
ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا — کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

اور آگے بڑھئے ـــــ مذہبیت کا ایک عمومی ڈھانچہ جن لوگوں کے دم سے قائم ہے وہ اکثر و بیشتر تجارت پیشہ طبقے کے کچھ مذہبی لوگ ہیں جو مسجدیں تعمیر کرتے اور انہیں آباد

کرتے ہیں، مدارس قائم کرتے اور انہیں چلاتے ہیں اور مساجد ومدارس کے اہتمام وانتظام کا سارا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ دیندار ہوتے ہیں' وہ خود نمازیں پڑھتے' زکوٰۃ دیتے اور حج کرتے ہیں' لیکن ان کے ذرا قریب ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی اکثریت کے یہاں آمد و خرچ کے معاملے میں حلال و حرام کی تمیز یکسر ختم ہو چکی ہے۔ سودی کاروبار ہنیئاً مریئاً ہوتا ہے' اور جھوٹ سچ کا کوئی فرق کاروبار میں نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ ایک صوفی منش بزرگ نے پچھلے دنوں بڑے گہرے تأثر کے ساتھ فرمایا کہ:

"پورے پاکستان میں شاید کوئی ایک مسجد بھی ایسی نہ مل سکے جو خالص حلال ذرائع سے کمائے ہوئے روپے سے تعمیر کی گئی ہو!" ـــــ اس پر مستزاد یہ کہ ان مساجد ومدارس میں چودھراہٹ کے حصول اور اس کو برقرار رکھنے کیلئے جس قسم کے جوڑ توڑ ہوتے ہیں اور جو جو سازشیں کی جاتی ہیں ان کے سامنے میدانِ سیاست کے جوڑ توڑ بھی شرما کر رہ جائیں۔

علماء کے طبقے کو دیکھئے ـــــ تو اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین جیسا کچھ اور جتنا کچھ آج موجود ہے وہ انہی کے دم سے اور انہی کی کوششوں کی بدولت ہے ـــ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حلقے میں کہیں کہیں علم و عرفان کی شمعیں بھی روشن ہیں اور ایمان وایقان کی مشعلیں بھی ـــ اور ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اصحابِ علم بھی ہیں اور اربابِ عمل بھی' جن کی گفتار قلوب میں گداز پیدا کرنے والی اور کردار لوگوں کیلئے عزیمت کا سامان مہیا کرنے والا ہے' لیکن یہ بھی ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے' اور علماء کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ نہ دلوں میں ایمان کی شمع ایسی روشن ہے کہ ماحول کو منور کر سکے ـــ نہ اخلاق واعمال اس درجے کے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر سکیں۔ تعلیم وتعلم اور درس وتدریس ان کی ایک بڑی اکثریت کا پیشہ بن کر رہ گیا ہے اور بڑے بڑے دارالعلوموں میں یہ افسوسناک اور تکلیف دہ صورتحال نظر آتی ہے کہ پیشہ ورانہ چشمک اور رقابت وحسد ـــ اور آپس کے جھگڑوں اور مناقشوں کے اعتبار سے وہ خالص دنیادار اداروں سے کسی طرح مختلف نہیں!

رہی یہ کمی کہ ان کی ایک بڑی اکثریت موجودہ دنیا کے علوم وفنون سے بیگانۂ محض ہے، تو اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے! اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علماء کا اثر معاشرے کے طبقۂ متوسط کے بھی صرف نصفِ ادنیٰ تک ہی پہنچ پاتا ہے اور موجودہ معاشرے میں ان کی حیثیت زندگی کی اصل منجھدار سے کٹی ہوئی ایک علیحدہ شاخ سے زیادہ کچھ نہیں!

ان تلخ حقائق کو پیش نظر رکھ کر خدارا سوچئے کہ کیا محض اس دلیل سے کہ "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا!" یہاں اسلام قائم ہو جائے گا یا سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانے سے اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا؟ یا محض عوام کے مذہبی جذبات کے اشتعال سے مغربی تہذیب وثقافت کی یلغار رک جائے گی؟ یا محض منفی مدافعت ومخالفت سے دین میں تحریف کا سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ ـــ اپنے اس طرز عمل کیلئے لاکھ دلائل پیش کر دیجئے، سینکڑوں خوش نما تاویلات گھڑ لیجئے ـــ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ آج بیس[1] سال سے ایک فعّال مذہبی وسیاسی جماعت اور طبقۂ علماء کے سیاسی مزاج بزرگ اس طریق پر عمل پیرا ہیں، لیکن حالات ہیں کہ روز بروز خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بزعمِ خویش کوئی کتنا ہی الحاد وبے دینی اور فحاشی وبے حیائی کے سیلاب کے آگے بند بنا کھڑا ہو، واقعہ یہ ہے کہ نہ الحاد وبے دینی کے سیلاب میں کوئی کمی آئی ہے نہ فحاشی وبے حیائی کے ـــ الٹا اس فعّال دینی جماعت کا جو سیاست کے میدان میں مذہب کی علمبردار بن کر اتری تھی یہ حشر ضرور دیکھنے میں آیا کہ رفتہ رفتہ اس کی مذہبیت تو تحلیل ہو کر ختم ہوتی چلی گئی اور نری سیاسیت باقی رہ گئی، تا آنکہ اب اس کے نزدیک پاکستان میں اسلام کے مستقبل کا سارا دارومدار اس پر رہ گیا ہے کہ یہاں انتخابات بلاواسطہ ہوں اور پارلیمانی جمہوریت کا نظام بحال کر دیا جائے ـــ فاعتبروا یا اولی الابصار!

ہماری قومی زندگی کا دھارا پورے زور وشور سے ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے اور تا حال مذہبی طاقتیں اس پر کسی قسم کا کوئی اثر ڈالنے اور اس کے رخ کو تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ دوسری طرف ملکی حکومت کو ہر آن نئی مشکلات ومسائل کا سامنا ہے اور

---

[1] واضح رہے یہ تحریر ۱۹۶۷ء کی ہے!

بین الاقوامی سیاست کے بدلتے ہوئے رنگ اور بڑی طاقتوں کی بدلتی ہوئی حکمت عملی سے صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ مستقبل میں پاکستان کو اپنی سالمیت کے تحفظ کیلئے بڑی کٹھن مشقت وریاضت کرنی ہو گی اور بڑے نامساعد حالات سے گذرنا ہو گا۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اگر مذہبی حلقوں کی نری سیاسی نعرہ بازی اور محض منفی مدافعت ومخالفت کی حالیہ روش برقرار رہی اور کوئی زبردست مثبت دینی دعوت ایسی نہ اٹھی جو ذہنوں کو مفتوح اور قلوب کو مسخر کر سکے تو کسی مشکل وقت میں اعصاب کا تناؤ ایسی صورت پیدا نہ کر دے کہ پھر اسلام کا نام لینا بھی مشکل ہو جائے!

اسی اہم خطرے کی نشاندہی کیلئے ہم نے یہ طویل معروضات پیش خدمت کی ہیں اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ اس سے ہمارا مقصد نہ کسی کی دلآزاری ہے نہ توہین وتنقیص' البتہ کچھ تلخ حقائق کا مشاہدہ بعض اوقات 'تلخ نوائی' پر منتج ہو ہی جاتا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ اس پر ہمیں معذور سمجھا جائے اور ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ اقول قولی ھذا واستغفر اللہ رب العالمین ○ (میثاق' مئی ۱۹۶۷ء)

☆ ☆ ☆

نوٹ!

اس سلسلۂ مضامین کی اگلی قسط جو

ماہنامہ 'میثاق' لاہور کے جون ۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوگئی تھی

جس کے اب تک آٹھ ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں!

اور جس میں بیان شدہ لائحہ عمل پر پیہم سعی وجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ:

1. ۱۹۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' کا قیام عمل میں آیا ———— اور
2. ۱۹۷۷ء میں 'قرآن اکیڈمی' قائم ہوئی — فَلِلّٰہِ الحمد!!

باب پنجم

دورِ ایوّبی میں

حکومت اور مذہبی طبقات کے مابین تصادم

کے دو اہم واقعات

——— (۱) ———

ہنگامۂ عید

اوائل ۶۷ء

——— (۲) ———

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

کی تالیف "اسلام" کی اشاعت

پر دینی حلقوں میں شدید ناراضگی کی لہر

اواخر ۶۸ء

۱۔ ہنگامۂ عید
ایک لمحۂ فکریہ

(ماخوذ از ــــــ 'میثاق' مارچ ۶۷ء)

علامہ اقبال مرحوم تو یہ حسرت ہی لئے اپنے رب کے پاس پہنچ گئے کہ ان کی عید ـــ "عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین" کے بجائے "عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں" ہوتی' لیکن پوری پاکستانی قوم اس اعتبار سے کچھ زیادہ ہی بد نصیب واقع ہوئی ہے کہ آزادی کے بعد بھی بجائے اس کے کہ اس کی عید "شکوہِ ملک و دیں" کا مظہر بنتی الٹی 'انتشارِ ملک و دیں' کی علامت بن کر رہ گئی اور اس سال یہ معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب 'حکومتِ ملک' ایک طرف اور 'رجالِ دین' دوسری طرف ایسے مورچہ بند ہوئے کہ انتشار و افتراق کی حد ہو گئی ـــ حتیٰ کہ اکثر لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ ـــ "اس سال عید ہوئی ہی نہیں!"

'دین' کے کچھ 'نادان دوست' اس صورت حال پر بغلیں بجاتے رہے ہیں کہ اس سال حکومت کو مکمل مات ہو گئی اور پورے ملک میں ان تمام لوگوں نے جنہیں دین سے ذرا سا بھی لگاؤ اور تعلق ہے علماء کے فتوے پر عمل کیا' اور اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اس ملک کے عوام دین کے معاملے میں حکومت کے بجائے کلیتہً علماء پر اعتماد کرتے ہیں ـــــ ہماری رائے میں ان کی اس مسرت سے سوائے اس کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ غالباً یہ حضرات بہت ہی شدید احساسِ کمتری کا شکار ہیں ورنہ وہ آفتاب کے وجود کے لئے خود آفتاب ہی کو دلیل بناتے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اثر نہ لیتے ـــــ یہ بات کہ پاکستان کے مسلمان دین کے معاملے میں اصل اعتماد علماء ہی پر کرتے ہیں اور دوسرے کسی بھی ادارے کو ان کے مقابلے میں قابلِ استناد نہیں جانتے' ایک پہاڑ جیسی حقیقت ہے اور اس کے ثبوت کے لئے اس قسم کے ادنیٰ مظاہروں سے استناد کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے!

البتہ ایک دوسرا پہلو جو ہماری رائے میں ان حضرات کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور جس کی طرف توجہ مبذول کرانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں یہ ہے کہ اس قسم کے مظاہرے ان جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سے بیزار اور متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں جن کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یقیناً ایک حقیر اقلیّت کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان ہی کے ہاتھ میں اس ملک کی زمام کار اور تمام معاملات کی باگ ڈور ہے اور وہی اس کے تمام انتظام و انصرام کے ذمہ دار اور اس کی پوری اجتماعی زندگی کے حوالہ دار ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی اکثریت دین سے ناواقف ضرور ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ دین کے دشمن ہیں اُن کے ساتھ شدید ناانصافی ہی نہیں، خود دین اور اس ملک میں اس کے مستقبل کے اعتبار سے پرلے درجے کی کوتاہ بینی اور ناعاقبت اندیشی ہے! ۔ دین سے اُن کا بُعد براہ راست نتیجہ ہے اس مخصوص ماحول کا جس میں وہ پلے بڑھے ہیں ـــــ اور اس نظامِ تعلیم کا جس کے تحت انہوں نے علوم و فنون کی تحصیل کی ہے ـــــ اور ہر اس شخص یا جماعت کے لئے جسے اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے ساتھ کچھ بھی مخلصانہ دلچسپی ہو' یہ لازمی ہے کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے اس بُعد کو کم کرنے کی کوشش کرے اور خصوصاً ایسی صورت سے حتی الامکان اجتناب و احتراز کرے جس سے اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو!

ہمارے نزدیک یہ صورت حال کسی طرح خوش آئند قرار نہیں دی جاسکتی کہ اس معاملے میں 'حکومتِ ملک' اور ' رجالِ دین ' نے دو مخالف کیمپوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک طرف حکومت کے ذمہ دار افسروں' برسراقتدار جماعت کے زعماء اور پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے اس مسئلے پر بیان بازی اور مضمون نگاری کو ایک مستقل مشغلہ بنا لیا ـــــ اور وہ سارا الزام علماء کو دیتے رہے ـــــ اور دوسری طرف علماءِ دین اور مذہبی سیاست کے علمبردار اپنے موقف کو درست ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے رہے اور جو کچھ ہوا اس کی پوری ذمہ داری انہوں نے حکومت پر ڈال دی۔

ہمارے نزدیک یہ سوال کہ جو کچھ ہوا' اس کی اصل ذمہ داری کس پر ہے، اوّل تو ہے ہی نہایت غیر اہم' اس سے کہیں زیادہ غور و فکر کا مستحق مسئلہ یہ ہے کہ آئندہ اس مسئلے کا

حل کیا ہو اور ایسی صورت حال کا تدارک کیسے کیا جائے ـــــــ دوسرے اس کا صحیح تعین کہ اس کے پیچھے کون کون سے عوامل اور محرکات کام کر رہے تھے، یہ بھی بہت مشکل ـــــــ اور خصوصاً یہ تو اندھے تعصب اور گروہی عصبیت کے غلو کے بغیر ناممکن ہے کہ اس معاملے کی پوری ذمہ داری کسی ایک فریق پر ڈال دی جائے۔

بادی النظر میں جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اولاً حکومت کی اس کوتاہی کو دخل ہے کہ اس نے نہ علاقائی بنیاد پر رویتِ ہلال کا کوئی ایسا بندوبست کیا کہ ' شہادتِ شرعی ' کے قیام کا اطمینان ہو سکتا ـــــــ اور نہ ہی مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی میں عوام کے معتمد علیہ علماء کو مناسب نمائندگی دی' پھر ایک مزید غلطی یہ ہوئی کہ ریڈیو پر رویتِ ہلال کا پہلا اعلان بالکل مجمل اور غیر تسلی بخش تھا' اور جب تک دوسرا اعلان ہوا' اول تو اس وقت تک بے چینی اور بے اطمینانی کی لہر پورے ملک میں دوڑ چکی تھی اور دوسرے وہ بھی قدرے مفصل ہونے کے باوجود پوری طرح اطمینان بخش نہ تھا ـــــــ دوسری طرف واقعہ یہ ہے کہ علماء کے طرز عمل سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ پہلے سے سخت غیر مطمئن تھے۔ اور عدم اطمینان کے اظہار کے لئے انہیں کچھ وجوہ کی ضرورت تھی جو بروقت پوری ہو گئی ـــــــ ہماری رائے میں نہ حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی نیت میں خلل اور فتور قرار دینے کے لئے کوئی وجہِ جواز موجود ہے اور نہ ہی ملک کے پورے طول و عرض میں ہر طبقہ فکر کے علماء کے فوری (SPONTANEOUS) اور یکساں ردِ عمل اور متفقہ فیصلے کے پیش نظر یہ کہنے کے لئے کوئی بنیاد موجود ہے کہ اس کی پشت پر کوئی سازش کام کر رہی تھی ـــــــ حکومت کے ذمہ دار لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے سہل انگاری اور بے پروائی سے کام لیا اور علماء کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے عمومی عدمِ اطمینان کو ظہور و خروج کا ایک موقع مل گیا ـــــــ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہماری رائے میں حدود سے تجاوز ہے اور جو کوئی بھی ایسا کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ اربابِ اقتدار کا ترجمان ہو یا طبقۂ علماء کا نمائندہ ـــــــ وہ خواہ مخواہ حکومت اور علماء کے مابین خلیج کو وسیع و عمیق کرنے کے درپے ہے ـــــــ اور اسے کسی بھی طرح نہ ملک و ملت کی خیر خواہی قرار دیا جا سکتا

ہے نہ دین کی۔ !

اس سلسلے میں ہم حکومتِ پاکستان اور علمائے کرام دونوں کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

صدر ایوب اور حکومت پاکستان کے ذمہ دار افسروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ حضرات ان معاملات میں ملک کی عظیم اکثریت کے احساسات و جذبات کا مناسب حد تک لحاظ رکھیں اور ان مسائل کو کم از کم اتنی اہمیت ضرور دیں جس کے وہ واقعتاً حق دار ہیں ــــــ اگر کسی وجہ سے آپ کے نزدیک یہ مسائل غیر اہم ہوں یا زندگی کے تلخ تر حقائق اور ملک و ملّت کے اہم تر مسائل کے مقابلے میں یہ آپ کو غیر اہم نظر آئیں ــــــــــــ تب بھی یہ حقیقت تو مسلّمہ ہے کہ ملک کے عوام کے نزدیک یہ ان کے دین کا معاملہ ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں آپ کو چاہئے کہ ضلعی سطح پر بھی رویتِ ہلال کا ایسا بندوبست کریں کہ ' شہادتِ شرعی ' کے قیام کا اطمینان ہو سکے۔ اور مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی میں بھی ملک کے مختلف دینی فرقوں کے معتمد علیہ علماء کو مناسب نمائندگی دیں ــــــ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ کو اس کا حق حاصل ہو گا بلکہ ہماری دانست میں یہ ضروری بھی ہو گا کہ آپ اپنے فیصلے کو جبراً نافذ کریں اور اس کی خلاف ورزی کو قابل تعزیر جرم قرار دیں ــــــ لیکن اگر کسی وجہ سے آپ اس کھکھیڑ میں نہیں پڑنا چاہتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ آپ اس معاملے کو کاملتہً عوام اور ان کے علماء کے حوالے کر دیں عید کی تعطیلات دو ہی نہیں تین بھی کی جا سکتی ہیں پھر لوگ جانیں اور ان کے معتمد علیہ علماء ــــــ چاہے وہ ایک عید کریں چاہے دو یا تین ' حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہو گی ' الغرض ــــــ یا چنان کن یا چنیں!

علمائے کرام کی خدمت میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم آپ پر ' جرح ' کریں اور پھر پاسِ ادب بھی مانع ہے ' تاہم دین اور اس ملک میں اسکے مستقبل سے دلچسپی کی بناء پر ہم آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہیں کہ :۔

کیا آپ کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ آپ اس معاملے کو خالص قانونی نقطۂ نظر سے

دیکھتے ـــــ کہ ایک مسلمان ملک میں جس کے حکمران بھی مسلمان ہیں ـــــ (چاہے کسی کے نزدیک وہ کتنے ہی فاسق وفاجر ہوں!) حکومت کے مقرر کردہ ذمہ دار ادارے کی جانب سے اس اعلان پر کہ عید کا چاند ہو گیا ہے ـــــ خطاو صواب کی ساری ذمّہ داری اور عذاب و ثواب کا پورا بوجھ ان پر چھوڑتے ہوئے عید منالی جاتی ـــــ اور بعد میں اگر وثوق کے ساتھ یہ معلوم ہوتا کہ ایک روزہ رہ گیا ہے تو اس کی قضا دے دی جاتی؟

کیا واقعۃً اس معاملے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہیں ـــــ جن میں سے ایک میں حضرت ابوذرؓ یہ فرماتے ہیں کہ:۔

"اِنَّ خَلِیْلِیْ اَوْصَانِیْ اَنْ اَسْمَعَ وَاُطِیْعَ وَاِنْ کَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْاَطْرَافِ وَاَنْ اُصَلِّیَ الصَّلٰوۃَ لِوَقْتِھَا فَاِنْ اَدْرَکْتَ الْقَوْمَ وَقَدْ صَلُّوْا کُنْتَ قَدْ اَحْرَزْتَ صَلَاتَکَ وَاِلَّا کَانَتْ لَکَ نَافِلَۃً" (صحیح مسلم)

(ترجمہ) "میرے دوست (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں صاحبِ امر کی بات مانوں اور اس کی اطاعت کروں اگرچہ وہ ایک اعضا بریدہ غلام ہو۔ اور نماز کو اس کے وقت پر ادا کروں پھر اگر تُو لوگوں کے نماز پڑھ چکنے کے بعد پہنچے تو تُو پہلے ہی اپنی نماز محفوظ کر چکا ہو گا ـــــ ورنہ (ان کے ساتھ) تیری نماز نفل ہو جائے گی۔"

برا نہ مانئے! ـــــ ہم سب اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہم لوگ خود اپنے نجی و ذاتی مسائل اور اپنے اپنے حلقے کے لوگوں کے معاملات میں آسانی اور یُسر پیدا کرنے کے لئے شریعتِ اسلامی کی کن کن گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ـــــ اور قانون کی کن آخری حدود تک توسّع کی سعی کرتے ہیں! ـــــ تو کیا ضروری تھا کہ اس معاملے میں فتویٰ کی بجائے 'تقویٰ' ہی کو عمل کی بنیاد بنایا جاتا؟ ـــــ کیا ملی یکجہتی اور قومی اتحاد کی وقعت آپ حضرات کی نگاہوں میں افراد کی نجی مصلحتوں اور ضرورتوں سے بھی کم ہے ـــــ ؟ رویتِ ہلال کے سرکاری انتظامات میں جتنے سقم تھے وہ سب پہلے ہی سے

معلوم تھے ـــــ؟ تو یا تو آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے ہی سے عوام کو خبردار کر دیتے ـــــ اور خود اپنے طور پر رویت ہلال کی شہادتوں کے بہم پہنچانے ' فیصلے پر بروقت پہنچنے ' اور مناسب وقت تک اس کے اشتہار و اعلان کا بندوبست کرتے ـــــ یا اگر ان تمام اسقام کے باوجود آپ کے نزدیک رویتِ ہلال کا سرکاری انتظام ـــــ کراہت کے آخری درجے ہی میں سہی ـــــ قابل قبول تھا ـــــ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کے اعلان کے بعد آپ نے خواہ مخواہ کے تجسس اور چھان بین کی تکلیف کیوں گوارا کی۔ در آں حالیکہ نہ یہ کام آپ کے ذمّے تھا اور نہ آپ اس کے لئے تیار تھے؟

ہمیں تسلیم ہے کہ آپ دین کے معاملے میں حکومت کے طرزِ عمل کی وجہ سے بالعموم اور بجا طور پر غیر مطمئن ہیں لیکن خدارا اس امر کی اہمیت کا احساس فرمایئے کہ ہم اپنے آپ پر پورا کنٹرول رکھیں اور خبردار رہیں مبادا ہماری یہ بے اطمینانی بے قابو ہو کر ایسی صورتیں پیدا کر دے ـــــ جو نہ دین کے لئے مفید ہوں نہ ملک و ملّت کے لئے ـــــ! سیاسی جماعتوں کے لئے تو عوام کی بے چینی ـــــ اور بے اطمینانی چاہے وہ کسی سبب سے ہو بجائے خود ایک رحمت ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتی ہیں کہ ایسے مواقع پیدا ہوں جن پر عوام کو بر سر اقتدار لوگوں کے خلاف مشتعل کیا جا سکے ـــــ لیکن خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم دین اور دینی مسائل کو بھی گروہی سیاست میں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بر عکس ہمیں چاہیئے کہ اپنی تمام توجہات اس مخلصانہ کوشش پر مرکوز کر دیں کہ مسائل حل ہوں ـــــ اور باہمی اعتماد کی فضا بر قرار رہے ـــــ!

اس سلسلے میں ہم علمائے کرام کی خدمت میں گزارش بھی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مندرجہ ذیل دو امور پر کسی متفق علیہ نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں!

ایک یہ کہ کیا دین میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ بجائے رویتِ بصری کے قمری تقویم

ہی کی بنیاد پر عید منائی جائے ـــــــ؟ اس سلسلے میں جو ایک بات عوام میں مشہور ہو گئی ہے کہ اکثر عرب اور بعض دوسرے مسلمان ممالک میں اسی پر تعامل ہے تو تحقیق کرنی چاہیے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ ـــــ اور اگر ایسا ہے تو معلوم کرنا چاہیئے کہ وہاں کے علماء کے پاس اس کے حق میں کیا دلائل ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر رویتِ بصری ہی لازمی ہے تو کیا ملک میں کسی ایک مقام پر رویتِ ہلال کی شرعی شہادت کی بنا پر فاصلوں اور طول بلد اور عرض بلد کا لحاظ کئے بغیر پورے ملک میں عید منائی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہو تو طے کرنا چاہیئے کہ ایک مقام کی رویت کتنے فاصلے تک حجّت ہو گی۔ (اس سلسلے میں پاکستان کے شرقی و غربی خطّوں کا بُعد[1] خصوصاً لائقِ توجہ ہے!)

علماء کرام کا کسی ہنگامی وقت پر ایک منفی مسئلے پر متفق ہو جانا خواہ کتنا ہی خوش آئند نظر آئے، دین کا بھلا اگر کسی چیز میں ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مسئلے کے مثبت حل پر ان کا 'اجماع' ہو اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکے تو ہم کس منہ سے عوام کو (چاہے کسی کے نزدیک وہ کالانعام ہی ہوں!) ـــــ ملامت کر سکتے ہیں، اگر ان کی زبانوں پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ عام ہو جائے کہ ؏

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

---

[1] واضح رہے یہ تحریر ۱۹۶۷ء کی ہے جب مشرقی اور مغربی پاکستان متحد تھے!

۲۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تالیف 'اسلام' کی اشاعت پر دینی حلقوں میں شدید ناراضگی کی لہر

(ماخوذ از ـــــ 'میثاق' اکتوبر ۶۸ء)

گزشتہ ماہ ڈاکٹر فضل الرحمان[1] سابق ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تصنیف 'اسلام' کے خلاف جو شدید عوامی ردِ عمل ظاہر ہوا اور اس کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو جس بے بسی کے ساتھ اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا، اسے بلا خوفِ تردید مذہبی، سیاسی اور انتظامی تمام ہی نقطہ ہائے نظر سے پاکستان کی تاریخ کے قریبی دور کا اہم ترین واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے ـــــ مذہبی اعتبار سے اس لئے کہ معاملہ بنیادی طور پر عوام کے مذہبی اعتقادات سے متعلق تھا اور سیاسی و انتظامی اعتبار سے اس لئے کہ اس نے فی الواقع ایک سیاسی ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس طرح فوری طور پر لاء اینڈ آرڈر اور نظم و نسق کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

عوام کے مذہبی جذبات کا جو فوری اور ہمہ گیر اظہار اس موقع پر ہوا واقعہ یہ ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال 1953ء کی اینٹی قادیانی ایجی ٹیشن کے بعد کے پندرہ سالوں میں نہیں ملتی۔ عوام کے مذہبی احساسات کا یہ شدید ردِ عمل ایک اعتبار سے خوش آئند اور امید افزا بھی ہے اور ایک دوسرے نقطۂ نظر سے تشویش انگیز بھی۔ یہ بات بجائے خود تو بہت اچھی ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے مذہبی اعتقادات کے تحفّظ کے لئے پوری طرح کمربستہ ہوں اور اس معاملے میں کسی جانب سے بھی کوئی حملہ ہو تو وہ پوری ہمّت اور جرأت کے ساتھ سینہ سپر ہونے کو تیار رہیں۔ لیکن یہ امر کہ ان کا یہ مذہبی جذبہ کسی مسلسل اور پیہم سعی و جہد میں

---

[1] جواب 'مرحومین' کی فہرست میں داخل ہو چکے ہیں!

ڈھلنے کے بجائے صرف وقتی اور ہنگامی ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرتا ہے، جیسے کہ مذہب ان کے صرف جذبات سے متعلق ہو کر رہ گیا ہو، فی نفسہٖ تشویش انگیز اور مایوس کن ہے۔ اس لئے کہ یہ بہرحال ایک اٹل حقیقت ہے کہ مذہب کا دفاع صرف جذبات کی بنیاد پر وقتی اور ہنگامی تحریکیں اٹھانے سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے محکم عقلی بنیادوں پر مسلسل اور پیہم جدوجہد ناگزیر ہے۔

یہ امر مزید افسوس ناک ہے کہ اس موقع پر بعض سیاسی عناصر نے بھی عوام کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی اور اپوزیشن کے بعض حلقوں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق اسے ایک سیاسی مسئلہ بنانا چاہا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر فضل الرحمان نے اپنے اس وضاحتی مضمون میں بھی کیا تھا جو لاہور کے ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا اور پھر اپنے استعفےٰ میں بھی کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ طرز عمل نہایت خطرناک ہے اور اپنے اس خیال کو ہم خاص طور پر اس لئے بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت ان عناصر کو بزعمِ خویش جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ انہیں یہ خطرناک کھیل کھیلنے میں جری نہ کر دے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی متعدد بار ان صفحات میں واضح کیا ہے ـــــ اور اب پھر کسی قدر وضاحت کے ساتھ عرض کریں گے ـــــ! پاکستان ہی نہیں، پورے عالم اسلام میں اس وقت مذہبی اعتبار سے متجدّ دین اور قدامت پسند لوگوں کے دو حلقے فی الواقع موجود ہیں جن کے طرزِ فکر اور مجموعی مزاج میں بڑا بُعد ہے اور جو اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ ان کے مابین نزاع کسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ ہمہ گیر ہے اور اس نزاع کا حل سیاسی ہنگاموں سے نہیں بلکہ مستقل افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے ہی سے ممکن ہے۔ ان اختلافات کے حل کا اصل پلیٹ فارم علمی مجالس ہیں نہ کہ عوامی جلسے اور جلوس۔ مؤخر الذکر طریقے سے معاملہ اگر سو بار سیدھا ہو سکتا ہے تو ایک بار بالکل الٹا بھی پڑ سکتا ہے اور اس کا نتیجہ کسی کے حق میں بھی مفید نہ ہو گا۔[1]

اس موقع پر مقامی و ضلعی سطح سے لے کر مرکزی حکومت تک ملک کی پوری انتظامی مشینری کا رویّہ بہت قابل داد رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی جگہ سے بھی تشدّد کی کوئی اطلاع

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

موصول نہیں ہوئی۔ مقامی و ضلعی حکام نے نہایت دانش مندی اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ اور ایک طرف عوام کو یہ اطمینان دلا کر کہ وہ ان کے احساسات و جذبات کو حکومت تک پہنچا دیں گے ان کے جذبات کو مزید مشتعل ہونے سے روکا اور دوسری طرف فی الواقع حکومت کو صحیح صورت حال سے بروقت مطلع بھی کر دیا۔ نتیجۃً بروقت ایک صحیح اقدام ہو گیا اور صورت حال بگڑنے سے بچ گئی۔

اس صورت حال کا تقابل 1953ء سے کیا جائے تو ایک عجیب تضاد سامنے آتا ہے، اُس وقت ملک میں وہ پارلیمانی جمہوریت قائم تھی جس کا از سر نو احیا جمہوریت کے اُن علمبرداروں کا مقصدِ زندگی بن گیا ہے جو موجودہ حکومت کو ' آمرانہ ' قرار دیتے ہیں۔ لیکن اُس وقت کی ' جمہوری ' حکومت نے عوام کے مطالبات کا جواب اینٹ پتھر ہی نہیں اشک آور گیس اور گولی سے دیا تھا۔ اور اُس وقت کی حکمران جماعت کے بعض عناصر نے اس خالص دینی و مذہبی مسئلے کو بھی اپنی جماعتی سیاست اور اس کے اندرونی جوڑ توڑ اور سازش و ریشہ دوانی کے سلسلے کی ایک کڑی بنانے میں کوئی شرم محسوس نہ کی تھی ــــ نتیجۃً ایک عظیم سیاسی شورش برپا ہوئی تھی اور بے اندازہ خون خرابہ ہوا تھا۔ جس کے نتائج پاکستان کی سیاسی زندگی میں بہت دوررس ثابت ہوئے ــــ اس کے بالکل برعکس رویہ

فٹ نوٹ متعلق بہ صفحۂ سابقہ:

۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی موومنٹ اس کی ایک اہم مثال ہے۔ آنجہانی غلام احمد قادیانی کی اُمّت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اگر ٹھنڈے استدلال اور دھیمی اور سہج چال کے ساتھ اور تسلسل و استقلال سے ہوتا تو یقیناً اس کے بہتر نتائج نکلتے لیکن ایک جذباتی و ہنگامی تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر کے لیے تو خوب زور بندھا اور شور و ہنگامہ برپا ہوا لیکن اس کے بعد صورت یہ ہوئی کہ اب اس مسئلے پر بات کرنا بھی ممکن نہیں ــــ پھر خاص اس مسئلے کے علاوہ اس تحریک سے جو نقصانات اس ملک کو سیاسی و دستوری اور دینی و مذہبی ہر اعتبار سے پہنچے ان کا تذکرہ تحصیلِ حاصل ہے (واضح رہے کہ یہ تحریر ۶۸ء کی ہے اور الحمد للہ کہ ۱۹۷۴ء میں ختمِ نبوت کی تحریک اُسی اسلوب پر چلی جس کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی۔ چنانچہ کسی نہ کسی درجہ میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی!)

موجودہ ' آمرانہ ' حکومت کا ہے کہ اس نے عوام کے جذبات کے آگے گھٹنے ٹیک دینے میں کوئی عار محسوس نہ کی اور ملک کو خون خرابے سے بچالیا۔ اس مسئلے سے قطع نظر کہ اس کا اصل محرک عوامی جذبات واحساسات کا واقعی احترام ہے یا اپنے وقتی سیاسی مصالح' یہ امر بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ اگر اِس وقت کے حکمران بھی اسے اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیتے تو بالکل 1953ء کے سے حالات و واقعات رونما ہو کر رہتے اور ملک میں شدید افراتفری برپا ہوتی — ہم حکومتِ وقت کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اُس نے ملک وملت کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر ایک وقتی سبکی کو برداشت کرلیا۔

اس معاملے میں سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر فضل الرحمان کی ذات کو پہنچا ہے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان پر کسی قدر زیادتی بھی ہوئی ہے۔ نزاع تو دراصل دو مکاتبِ فکر اور دو نقطہ ہائے نظر کا تھا— یا پھر کسی درجے میں حکومت اور اپوزیشن کا۔ لیکن چونکہ اس وقت اتفاق سے اُن کی ذات میں یہ دونوں حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں کہ وہ دین میں متجددانہ مکتب فکر کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے بھی سامنے آئے اور ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے بھی' لہٰذا تنقید و ملامت کا اصل ہدف وہ بن گئے اور سب سے زیادہ مجروح ان کی شخصیت ہوئی۔ پھر جیسا کہ ایسے معاملات میں عموماً ہوتا ہے' ان کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ بعض باتیں ان کی جانب غلط بھی منسوب کی گئیں اور ان کے بعض ایسے فقروں کا جو ایک سے زیادہ مفہوموں کے متحمل ہو سکتے تھے، ایک خاص متعین مفہوم بھی ان کے سر تھوپا گیا۔ اور ہنگامے کے شور و شغب میں ان کی تمام وضاحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا — ہمارے ڈاکٹر صاحب سے نہ تو ذاتی مراسم ہیں اور نہ ان سے براہ راست تبادلۂ خیالات کا موقع ہی ہمیں کبھی ملا ہے[1] لیکن ایک دو مواقع پر انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی گفتگو کو سننے کا موقع ضرور حاصل ہوا ہے۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں

---

[1] راقم الحروف کی ڈاکٹر صاحب موصوف سے پہلی ملاقات شکاگو (امریکہ) میں ۱۹۷۹ء میں ہوئی، جس کے بعد متعدد ملاقاتوں میں مفصل تبادلہء خیالات بھی ہوا!

اسلام کے خلاف 'نشوز' پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین وایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ایک دینی پرچے میں ان کے بارے میں ایک بہت بڑے عالمِ دین کا یہ قول دیکھ کر ہمیں دکھ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تو بس وہی کچھ لکھتے ہیں جس کا اشارہ انہیں 'اوپر' سے ملے (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی !)

_____ ہماری رائے میں 'اسلام' ڈاکٹر صاحب کے اپنے آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس سے ان کی وسعتِ مطالعہ اور دقّتِ نظر کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے _____ یہ دوسری بات ہے کہ ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر ان کا نقطۂ نظر ایک خاص رخ پر ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فکر و فلسفے اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تصنیف میں جہاں بہت قیمتی علمی مواد بھی موجود ہے اور بعض نکات بڑے دقیق اور نہایت وقیع بھی ہیں وہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر یا زیادہ سے زیادہ 'عقلیتِ محض' اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور 'اسلام' کا یہ پورا مطالعہ مغربی فکر و فلسفے کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ معاملہ ایک ڈاکٹر فضل الرحمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی ایک بہت بڑی اکثریت اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اور ہماری قومی و ملّی زندگی کے تمام فعّال عناصر اسی روگ کا شکار ہیں۔ ان میں جو جتنا ذہین اور جری ہے وہ اتنا ہی اپنے اصل نظریات و افکار کے ظاہر کرنے میں بیباک ہے۔ ورنہ اکثر و بیشتر کا اصل نقطۂ نظر فی الواقع یہی ہے اور عقلیتِ جدیدہ کے اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ سرسیدؒ مرحوم سے جس مکتبِ فکر کی بنیاد پڑی تھی اس سے ہمارا سارا ہی تعلیم یافتہ طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر متأثر ہے۔ اور سائنس و ٹیکنالوجی سے مرعوبیت نے مغربی فکر و فلسفے کو پوری ملّتِ اسلامیہ کے پڑھے لکھے طبقے کے قلوب و اذہان میں راسخ کر دیا ہے۔ یہ تو خدا بھلا کرے بانیینِ دیوبند رحمۃ اللہ علیہم کا کہ ان کی کوششوں کی بدولت قال اللہ و قال الرسولؐ کا ڈنکا کم از کم عوامی سطح پر بجتا رہا۔ اور عوام کے معتقدات و معمولات میں دین و مذہب کا ایک ڈھانچہ محفوظ رہ گیا _____ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ 'عقلیتِ جدیدہ' کے اس سیلاب کے آگے کوئی بند تا حال نہیں باندھا جا سکا اور جس کسی نے بھی قال اللہ و قال

الرسولؐ کے محفوظ گوشوں سے نکل کر اس سیلاب کی راہ میں آنے کی جرأت کی اسے اکثر و بیشتر خود اپنی متاعِ یقین سے ہاتھ دھو لینے پڑے ـــــ!

بنابریں ـــــ ہمارے نزدیک اصل اہمیت شخصِ فضل الرحمان کی نہیں بلکہ اس مکتبِ فکر کی ہے جس کی مدلّل و مبسوط نمائندگی انہوں نے کی ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی تصنیف 'اسلام' کی اشاعت کا ایک پہلو مفید بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے ذریعے دین میں تجدّد کے علمبرداروں کا پورا مقدمہ اپنے بھرپور اور مکمل استدلال کے ساتھ یک جا سامنے آ گیا ہے۔ اس مکتب فکر کی نمائندگی اس سے پہلے صرف مسٹر غلام احمد پرویز کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات و تالیفات' اگرچہ ان کی تعداد بعض دوسرے بسیار نویس اہل قلم کے مانند درجنوں میں ہے' کسی محکم و مربوط فلسفے یا ٹھوس علمی و فکری مواد کی حامل نہیں ہیں بلکہ اکثر و بیشتر صرف خطابت' انشا پردازی اور جذبات نگاری کا مرقّع ہیں ـــــ اس کے بالکل برعکس معاملہ 'اسلام' کا ہے۔ یہ بظاہر مختصر کتاب ایک متعین فکر پر مبنی ہے۔ اور اس نے اسلام کے اساسی اعتقادات سے لے کر نظام شریعت کی تفصیلی تشکیل تک پورے مسئلے کو ایک خاص نقطۂ نظر کے ساتھ مربوط شکل میں پیش کیا ہے اور اپنے طرز فکر کی تائید و تقویت کے لئے ایک ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ بھی اسی نقطہ نظر سے کر دکھایا ہے اور اس کی عقلی توجیہہ بھی پیش کر دی ہے۔ گویا کہ اب کی بار تجدّد "پائے چوبیں" کے ساتھ سامنے نہیں آیا ہے بلکہ 'آہنی ٹانگوں' کے ساتھ آیا ہے چاہے وہ اغیار سے ہی مستعار لی گئی ہوں۔ لہٰذا عوام کے لئے تو یہ کافی ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔ لیکن اہلِ علم رجالِ دین کو اصل فکر اس علمی و فکری چیلنج کا جواب دینے کی کرنی چاہئے۔ ہمارے نزدیک یہ وقت کا ایک بہت اہم مطالبہ ہے اور حقیقی عافیت اس سے آنکھیں چرانے میں نہیں بلکہ اس کا مواجہہ (FACE) کرنے میں ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حِصّہ دوم

اسلام اور پاکستان

علمی اور ثقافتی پس منظر

باب اوّل

اسلام کی تاریخ میں

عقل اور نقل کی کشمکش

کے ۲ دو اہم دَور ——— اور

برِّصغیر پاک و ہند میں

علی گڑھ اور دیوبند

کے متضاد مکاتبِ فکر کا قیام

باب دوم

علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین

چند درمیانی راہیں

باب اوّل

اسلام کی تاریخ میں عُقل اور نُقل کی کشمکش

کے دو اہم دَور

اور برصغیر میں علی گڑھ اور دیوبند کے دو متضاد مکاتب فکر کا قیام

(تذکرہ وتبصرہ ــــ 'میثاق' لاہور، اکتوبر ۶۸ء)

اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کا نزاع تقریباً ابتداء ہی سے چلا آ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ 'مذہب' اپنی اصل کے اعتبار سے 'نقل' ہے جو اولاً فرشتے کی وساطت سے خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا اور پھر ان کی ذات گرامیؐ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے لہٰذا اس کی اساس 'نقل' پر ہے نہ کہ 'عقل' پر..... لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب انسان ہیں جو چاہے تمام کے تمام 'ذوی العقول' نہ ہوں، لیکن پیروی چونکہ وہ اپنی اسی اقلیت کی کرتے ہیں جو 'ذی العقل' ہوتی ہے، لہٰذا انسان پر بحیثیتِ مجموعی حیوانِ عاقل کا اطلاق غلط نہیں ہے۔ بنا بریں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ بالکل ابتداء ہی سے مذہب کے 'نقل' کو 'عقل' پر پرکھنے اور اس کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوششیں ہوتی چلی آئی ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہر دور کی عقلی وفکری سطح کے مطابق علمِ کلام کا ذخیرہ تیار ہوتا رہا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست صحبت کی بدولت جو ایمان حاصل ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے اور کسی غیر صحابی کے ایمان کو اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ انہیں علم الیقین ہی نہیں حق الیقین کی جو کیفیت حاصل تھی اس میں استدلال کا عنصر اول تو تھا ہی بہت کم' اور جتنا تھا اس کی اساس بھی فطرت کے نہایت محکم لیکن سادہ دلائل پر تھی نہ کہ کسی پیچ در پیچ منطقیانہ قیل وقال پر۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر مبہم طریق پر واضح کر دی گئی ہے کہ اُمّت کے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کے ایمان کو نہیں پہنچ سکتا۔ اُن کے قلوب جس نورِ ایمان سے منور تھے اور ان کے سینے جس حرارتِ ایمانی سے معمور تھے ان کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کا "دلِ روشن" اور "نفسِ گرم" نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایمان نے ایک ایسے بے تابانہ جذبے اور والہانہ عشق کی صورت اختیار کر لی تھی جو ہر دم عمل کی بھٹیوں اور آزمائشوں اور ابتلاؤں کے الاؤں میں کودنے کو اس طرح آمادہ و تیار رہتا ہے کہ عقل بے چاری کے لئے "محوِ تماشائے لبِ بام" رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔[1]

دورِ صحابہؓ کے اختتام کے ساتھ ہی فطری طور پر ایمان کی ان کیفیات میں انحطاط واضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا اور "عشق کی آگ[2]" ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی۔ نتیجۃً فوراً عقل کے قیل وقال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں 'عقل' پر کئی دور آئے اور ہر دور میں اس کے صغریٰ و کبریٰ بدلتے رہے' لیکن مذہب کے 'نقل' کے ساتھ اس کا تصادم مسلسل جاری رہا' اور یہ پینترے بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوتی رہی۔ دوسرے طرف سے حامیان و حاملانِ نقل اس کی جانب سے مدافعت

---

[1] بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی۔ (اقبال)

اسی کی ایک ادنیٰ مثال ہے حضرت خالدؓ کا وہ قول جو انہوں نے غیر مسلم افواج سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "لوگو! تمہارا سابقہ اس قوم سے ہے جو موت کو اسی قدر عزیز جانتی ہے جس قدر تم زندگی کو!"۔

[2] بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے! مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے! (ایضاً)

کرتے رہے اور اس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں عقل اور نقل کے باہمی نزاع کا سلسلہ چلتا رہا۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مذہب کے نقل کی کامل عقلی توجیہہ نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی۔[1] اس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی نہایت محدود ہے اور زمان و مکان اور ظروف و احوال کے بہت سے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے' جبکہ دین ومذہب کی اساس جن وراء الوراء حقائق پر ہے وہ غیر محدود بھی ہیں اور نہایت لطیف بھی ـــــ شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حِکَم کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں عقل اپنی جولانیاں جتنی چاہے دکھالے' ایمانیات و اعتقادات کی سرحد شروع ہوتے ہی معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایمان جن غیر محدود' لطیف اور وراء الوراء حقائق کے مجموعے کا نام ہے اُن کا مجرّد نطقِ انسانی کی گرفت میں آنا بھی نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے' (تبھی تو اس مقام پر خود آسمانی کتابوں کو بھی اشاروں' کنایوں' استعاروں اور تمثیلوں پر اکتفا کرنی پڑتی ہے) ـــــ کجا یہ کہ انہیں ہر دور کی عقلی سطح پر وقت کے فلسفہ و منطق کے غایت درجہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے!!

چنانچہ ـــــ یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عقائدِ اسلامی کی عقلی توجیہہ کی

---

[1] یہ وہ 'محالِ عقلی' ہے جس کا منطقی امکان اگر کوئی ہے تو صرف اُس وقت جب علمِ انسانی ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے لئے حقیقتِ نفس الامری بالکل کھل جائے اور حقائقِ اشیاء بالکل 'کماہیَ' روشن ہو جائیں ـــــ اور ظاہر ہے کہ یہ صرف آخرت میں ہو سکے گا۔ !!

کوششوں سے بعض اوقات شدید نقصان بھی پہنچا۔ وقت کے فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھنے میں کبھی کبھی دین ومذہب کے بعض حقیقی اجزاء کو کھوٹا بھی سمجھ لیا گیا اور وقت کی منطق کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں کبھی کبھی دین ومذہب کے بعض پہلو مجروح بھی ہوئے ـــــ اس کے مقابلے میں 'محفوظ' راستہ ہمیشہ ان ہی کا رہا جنہوں نے محض نقل پر اکتفا کی۔ اسی کو سینے سے لگائے رکھا' اسی کے تحفظ میں زندگیاں کھپادیں اور اسے جوں کا توں اگلی نسل تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے ـــــ بایں ہمہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا چونکہ مذہب کے نقل کی عقلی توجیہہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے' لہٰذا ہر دور میں دین ومذہب کے مخلصین اس کے لئے کوشاں رہے اور خود اپنے دین وایمان کے لئے خطرات مول لے کر بھی اس خطرناک مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایسے لوگوں کی ان تمام کوششوں کا اصل محرک نصح ونصرتِ دین ہی کا جذبہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ گمان کہ وہ دین ومذہب کے دشمن تھے یا ان کا مقصد ہی اسلام کو گزند پہنچانا تھا ایک شدید قسم کی زیادتی اور ناانصافی ہے!

اصحابِ نقل کی جانب سے فطری طور پر ہر دور میں اصحابِ عقل پر نکیر بھی ہوتی رہی۔ لیکن اس کی بھی ہمیشہ دو سطحیں رہیں: ایک عوامی سطح جس پر مجرّد ردّ وا نکار اور اصحابِ عقل کی موشگافیوں سے بیزاریٔ محض کا اظہار ہوتا رہا۔ اور دوسرے علمی سطح پر' ایسے لوگوں کے ذریعے جنہوں نے اپنے دور کے فلسفہ ومنطق' علوم وفنون اور افکار ونظریات کے چشموں سے پوری طرح سیراب ہو کر اور اس طرح وقت کے عقلی معیار پر کاملاً پورے اتر کر ـــــ اور پھر خود ذہنی وعقلی اور قلبی وروحانی ہر اعتبار سے مذہب کے نقل پر مطمئن ہو کر اصحابِ عقل پر مدلّل تنقید کی۔ درحقیقت دین ومذہب کا اصل دفاع ہر دَور میں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس لئے کہ لوہا لوہے ہی سے کاٹا جا سکتا ہے اور عقل کا توڑ عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے!۔

دورِ اوّل اسلام کی تاریخ میں 'عقل' اور 'نقل' کا پہلا نزاع اُس وقت برپا ہوا جب اسلام کے اصحاب عقل نے یونان کے فلسفے اور ارسطو کی منطق کے زیر اثر اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششیں شروع کیں اور اس کے نتیجے میں اسلام کے اساسی ایمانیات و اعتقادات کے ضمن میں منطقی موشگافیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ عقل و نقل کی وہ جنگ شروع ہو گئی جس کا آغاز تو اگرچہ دورِ اُموی کے آخری زمانے میں ہو گیا تھا، لیکن جو اپنے پورے شباب کو دورِ عباسی میں پہنچی۔ اس جنگ میں اوّل اوّل دو بالکل انتہائی نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کی کامل ضد تھے۔

چنانچہ 'عقل خالص' نے معتزلہ کا روپ دھارا اور 'نقل محض' نے اصحاب ظاہر کی صورت اختیار کی، لیکن رفتہ رفتہ اس 'آویزش' میں 'آمیزش' کا رنگ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معتدل نظام ہائے اعتقادی وجود میں آئے اور اشعری و ماتریدی عقائد باقاعدہ مرتّب و مدوّن ہوئے اور عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے گوشۂ عافیت میں پناہ لی۔ خالص علمی سطح پر یہ نزاع بعد میں بھی جاری رہا اور امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ ایسے اصحابِ فکر و نظر عقلیت پرستی پر شدید 'عقلی' ضربیں لگا کر 'نقل' کے دفاع کا مؤثر بندوبست کرتے رہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ معتزلہ اور اصحابِ ظاہر کے تصادم کے نتیجے میں جو معتدل 'مسلکِ اہلِ سنت' اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نظام ہائے اعتقادی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس کا اصل تانا بانا بھی وقت کے فلسفہ و منطق ہی سے تیار ہوا ہے جس میں ایمان کے لازوال اور ابدی حقائق خوبصورتی کے ساتھ بُن دیئے گئے ہیں۔ گویا کہ اسے عقل اور نقل کا ایک حسین امتزاج تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ان تصریحات کے ساتھ کہ ایک تو اس میں اس شے حقیقت کو جو لازوال ولافانی اور ازلی و ابدی ہے، عقل و منطق کے ان پیمانوں میں پیش کیا گیا ہے جو بالکل عارضی اور وقتی ہیں، دائمی و مستقل نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ ان عقائد کے منطقی و کلامی طرز بیان میں 'حقیقتِ ایمان' بتمام و کمال سمو دی گئی ہے۔

ان عقائد کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک خاص دور کی عقلی سطح پر اور اس وقت کی متداول منطقی اصطلاحات میں 'حقائقِ ایمان' کی امکانی حد تک ترجمانی قرار دیا جا سکتا ہے اور بس!
دوسرے یہ کہ اُس وقت بھی مذہب کا دفاع اور عقل و نقل کا یہ امتزاج صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا جو بیک وقت صاحبِ عقل بھی تھے اور حاملِ نقل بھی۔ بالکل یک رخے لوگ اِس کام کے لئے اس وقت بھی بے کار تھے۔ چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مصنف[1] خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے' اور "الرّد علی المنطقیین" کے مؤلف[2] خود ایک بہت بڑے منطقی تھے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو خود وقت کے فلسفہ و منطق کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی گمراہی و کج فہمی کی جڑوں پر مؤثر تیشہ چلا سکے۔

دورِ ثانی اسلام پر عقلیت کا دوسرا بڑا حملہ آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ کے اُس فلسفہ و فکر کے زیر اثر شروع ہوا جس کی تعمیر خالص مادّہ پرستی کی اساس پر ہوئی تھی۔ برصغیر ہند و پاک میں یہ جدید 'مذہبی عقلیت' متعدد اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قرطاس کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی، جس میں جسٹس امیر علی کا نام بھی اگرچہ بالکل غیر اہم نہیں' تاہم ہر اعتبار سے اہم ترین نام سرسید احمد خان مرحوم کا ہے۔ فکر اسلامی کے اس دور میں ان حضرات کا مقام بالکل وہی ہے جو دورِ قدیم میں اوّلین معتزلہ کا تھا' یعنی مذہب کے نقل کے مقابلے میں عقل کی بالکل دوسری انتہا پر!
سرسیّد مرحوم کا ملّتِ اسلامی کے ساتھ اخلاص تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے ہی واقعہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے ساتھ مخلصانہ تعلّق میں بھی شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔
—— نماز روزے کے معاملے میں وہ متشدّد "وہابی" تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ایسا والہانہ تعلّقِ خاطر تھا کہ جب ۶۴-۱۸۵۸ء میں سر ولیم میور

---

[1] امام غزالیؒ

[2] امام ابن تیمیہؒ

کی کتاب "حیاتِ محمدؐ" شائع ہوئی، جس میں آنحضورؐ کی سیرت مبارکہ پر رکیک حملے کئے گئے تھے تو وہ سخت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور بقول ان کے ان کا "جگر خون ہو گیا" اور انہوں نے لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ 'میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں' اس کی اشاعت کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی' تم اول تو راجہ جے کشن داس سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ میری علی گڑھ والی کوٹھی فروخت کر دو!'

—— بایں ہمہ ان پر مغربی علوم وفنون اور خاص طور پر جدید سائنس کا ایسا رعب تھا اور مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر ان پر اس قدر غالب آگیا تھا کہ ان کی عینک سے جب انہوں نے دین ومذہب کا مطالعہ کیا تو اس کی بہت سی چیزیں انہیں ایسی نظر آئیں جن کو 'ماننے' کے بعد اہل مغرب سے آنکھیں چار کرنا ان کے نزدیک دشوار تھا' چنانچہ دین ومذہب کی خیر خواہی انہیں اسی میں نظر آئی کہ ایسی چیزوں کی حتّی الامکان تو عقلی وسائنٹفک توجیہہ کر دی جائے اور جن چیزوں کی توجیہہ کسی طرح ممکن نہ ہو' ان کا انکار کر دیا جائے۔

چنانچہ ملائکہ محض قوائے طبعیہ (FORCES OF THE NATURE) قرار پائے۔ —————— جنّ انسانوں ہی میں سے اجڈ' گنوار اور مشتعل مزاج لوگ ٹھہرے' معجزات کی خالص طبعی (PHYSICAL) توجیہہ ہوئی۔ جنت اور دوزخ کو مقامات (PLACES) نہیں بلکہ صرف کیفیات (STATES) قرار دیا گیا۔ مذہبی رواداری کا راگ الاپا گیا۔ اور جہاد کے بارے میں معذرت خواہانہ روش اختیار کی گئی دنیوی ترقی وعروج نظریات وافکار کی صحت کے ثبوت گردانے گئے اور مغربی تہذیب وتمدن اور طرزِ بود وباش کو مسلمانوں کے جملہ قومی وملّی امراض کا واحد علاج —— اور ان کے عروج وترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا —— چنانچہ بالکل صاف کہا گیا کہ مذہب کے علاوہ ہر بات میں انگریز بن جاؤ! —— اور نوبت بایںجا رسید کہ خود خدا کا تصوّر بھی حیّ وقیوم' سمیع وبصیر' رحیم وکریم' صاحبِ ارادہ ومشیّت اور غفور ومنتقم ہستی کے بجائے سائنس کے عِلّت العلل[1] (THE FIRST CAUSE)

---

[1] واضح رہے کہ علّت العلل اور مسبّب الاسباب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کی صورت اختیار کر گیا ـــــــــــ اور وحی و قرآن کے بارے میں جو تصوّر اختیار کیا گیا اور 'بے چارے' جبریل امینؑ کو جس طرح بیک بینی و دو گوش 'رخصت' کیا گیا وہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق[۱] است قرآنے کہ من دارم

گویا "مذہب" کی مکمل قلبِ ماہیت ہو گئی اور ہماری اپنی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق مذہب کا خالص 'غیر مذہبی ایڈیشن' تیار ہو گیا چنانچہ بالکل ٹھیک کہا تھا حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کہ

دیکھ کاریگریٔ حضرتِ سیّد اے شیخ
دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

ہم نے سرسیّد مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے یہ چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے کہ یہ واضح ہو جائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں، درحقیقتِ فکر سرسیّد ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسیّد بے چارے تو پھر بھی معذور تھے، اس لئے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی فکر کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی و عسکری قوت بھی بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے ان جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں، درآں حالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی "خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کر چکی، سائنس کی مادّہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی، اور مغرب کی سیاسی و عسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی!

---

[۱] اس شعر میں 'معشوق' کا اطلاق جس طرح آنحضورؐ پر بھی ہو سکتا ہے اور خدا پر بھی بالکل اسی طرح کا قول ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی ـــــ دونوں جگہوں پر اصل انکار جبریل امینؑ کا ہے ـــــ!

ع   بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی   ست!

بہرحال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکرِ سیّد کی ہے۔ شخصِ سرسیّدؒ تو بہت جلد اپنے ربّ سے جاملا لیکن فکرِ سرسیدؒ دراصل تاریخِ اسلامی کا ایک دور ہے جو تا حال جاری ہے۔ سرسیّدؒ مرحوم نے جو پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر میں قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا تعلق علی گڑھ سے وہی ہے، جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ پاک و ہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری طور پر اسی مکتبۂ فکر سے متعلق و منسلک ہیں جس کی ابتدا سرسیدؒ مرحوم نے کی تھی۔

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیّت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ و قال الرّسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفّظ کیا اور اس قول میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کی حفاظت کا مؤثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہدِ حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلّغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی و مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ۔ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف اُن کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس و میلاد اور فاتحہ و درود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریکِ دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق و منسلک ہیں۔

تحریکِ دیوبند کی ان مختلف شاخوں کے مابین مجموعی مزاج اور دائرہ ہائے کار کا فرق و امتیاز بھی ایک دلچسپ علمی موضوع ہے۔ ان میں اصل عوامی عنصر جو مذہب و سیاست دونوں کا مظہر یا بالفاظ دیگر مذہبی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار ہے ذہناً و قلباً

'حسینی' ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنی سے ذہنی تعلق اور قلبی ارادت و عقیدت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام بھی در حقیقت اسی کا تتمّہ یا صحیح تر الفاظ میں ضمیمہ ہے ۔ تھانوی اور عثمانی حلقے علمی ذوق اور متصوفانہ مزاج کے حامل ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید مولانا یوسف بنوّری کا مزاج خالص علمی ہے ـــ اور تبلیغی جماعت خالص غیر سیاسی وغیر علمی لیکن نہایت پرجوش وفعاّل مذہبیّت کا مظہر ہے ـــ ان تمام امتیازات کے علی الرّغم جہاں تک مذہبی فکر کا تعلق ہے وہ ان سب میں مشترک ہے۔ مذہب کے نقل کے یہ سب ایک سے فدائی ہیں۔ اور قال اللہ وقال الرّسولؐ ہی نہیں اس کی بھی ایک متعیّن صورت یعنی مسلکِ حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن وسنّت کا معروضی (OBJECTIVE) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامر ونواہی کے اَسرار و حِکَم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑا علمی مشغلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری و ماتریدی عقائد اور فقہ حنفی کے لئے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کئے جائیں ـــ دوسری طرف جدید علوم وفنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبعیات ' کیمیا' فلکیات ' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ پچھلی دو تین صدیوں میں فراہم کیا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ ومنطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلاواسطہ علم انہیں حاصل نہیں ـــ گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی وفکری اعتبار سے خالصتہً آج سے سات آٹھ سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں سے کچھ حضرات اپنی تحریر وتقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں ، واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسدِ ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحرِ محیط میں دو رو ئیں بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیٰحدہ علیٰحدہ بعینہٖ اسی کیفیت کے ساتھ چلی

جارہی ہیں جس کا نقشہ سورۃ الرحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○

چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے (بھی) ہیں (اور) ان کے مابین ایک حجاب (بھی) ہے (جس سے) تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان دو متضاد فکری و تہذیبی سو توں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیو بند کا اور پوری ملّت دو نمایاں طور پر مختلف مکاتب فکر و نقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک مضر اور مایوس کن ـــــ ایک جانب جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی ہے لیکن ملحدانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان و اسلام ہے لیکن جمودِ مطلق اور فرسودہ واز کار رفتہ فلسفہ و منطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتبِ فکر کو علیٰحدہ علیٰحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تا حال ان کے مابین امتزاج کی کوئی مؤثر صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر و بیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرج دار تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملّت اسلامیہ کی اس وقت کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ اس ’آویزش‘ میں کسی واقعی و حقیقی ’آمیزش‘ کا رنگ تا حال پیدا نہیں کیا جا سکا۔

☆ ☆ ☆

باب دوم

علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین

چند درمیانی راہیں

('تذکرہ وتبصرہ' ——— 'میثاق' لاہور ——— نومبر ۶۸ء)

یوں تو ایک عظیم ملّت میں فکر و نظر کے صدہا رنگوں (SHADES) کا پایا جانا ایک فطری اور قدرتی امر ہے' چنانچہ ہماری قوم میں بھی سوچنے کے لاتعداد انداز اور غور و فکر کے بے شمار طور طریقے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ذرا دقّتِ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فکر و نظر کے ان لاتعداد رنگوں میں اصل اور پختہ رنگ دو ہی ہیں۔ ایک علی گڑھ کا دوسرا دیوبند کا۔ بقیہ تمام رنگ جو ان کے مابین یا ان کے اِردگرد پائے جاتے ہیں سب ا[ن] کے امتزاج ہی سے وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے کسی میں علی گڑھ کا رنگ زیا[دہ] نمایاں ہے اور کسی میں دیوبند[1] کا۔

گویا کہ ہماری ملّت کے بحرِ محیط کی اصل دو رویں یہی ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے مَرَ[جَ] الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ○ کی طرح بالکل ملحق اور متصل لیکن بَیْنَهُمَا بَرْزَ[خٌ] لَّا یَبْغِیٰنِ ○ کی سی علیحدگی اور لاتعلقی کے ساتھ مسلسل چلی آ رہی ہیں۔ ——— میں سے ہر ایک کا ایک مستقل ماضی اور متعین فکری اساس ہے' اور چونکہ ان میں سے ہر ا[یک] کی پشت پر ایک وسیع و عریض اور پختہ و محکم نظام تعلیم بھی موجود ہے' لہٰذا ان دونوں [کے] اثرات نہایت دور رس ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے جسدِ ملی میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں

---

[1] کیا اللہ کی شان ہے کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے ان دونوں دینی و مذہبی اور تہذ[یبی و] ثقافتی سوتوں کے اصل منابع ہندوستان ہی میں رہ گئے...... اور یہی نہیں بلکہ جیسا کہ ب[عد] میں واضح ہو گا' ان دونوں کے مابین امتزاج کی جتنی کوششیں ہوئیں ان سب کے اصل مراکز بھی وہیں رہ گئے۔

گویا کہ یہ دونوں مکاتبِ فکر ہماری قومی وملّی زندگی میں "اَصۡلُهَا ثَابِتٌ" کی سی محکم اساس اور "وَ فَرۡعُهَا فِي السَّمَاءِ" کا ساہمہ گیر اثرونفوذ رکھتے ہیں۔

ان میں سے علی گڑھ کی 'مذہبی عقلیت' جسے جسٹس امیر علی' سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی وغیرہم نے مرتب کیا تھا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں' ساتھ ہی اس کے مقابلے میں دیوبند جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں پڑی اور جن کے ذریعے اس میں کتاب وسنّت کا علم ہی نہیں بلکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی کی روحانیت بھی سرایت کر گئی تھی' جس طرح قال اللہؐ اور قال الرسولؐ کا حصار اور دین ومذہب کے 'نقل' کے دفاع کا مرکز بنا' اس کی تفصیل بھی ہم بیان کر چکے ہیں ـــــ اور دونوں کے 'مذہبی فکر' کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے ـــــ لیکن اس کے بارے میں یہ گمان درست نہ ہو گا کہ یہ بُعد ہمیشہ' ہر حال اور ہر صورت میں موجود رہا۔ اس کے برعکس' واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھریں جو اپنے اصل مکتبِ فکر کے مجموعی مزاج کی بالکل ضد ثابت ہوئیں۔

چنانچہ "حسنؓ زبصرہ' بلالؓ از حبش' صہیبؓ از روم" کے مصداق سرزمینِ علی گڑھ سے بھی بہت سے راسخ العقیدہ' دردمند' ذہناً مسلم اور قلباً مومن لوگ اٹھے جن میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کی مثال ہی اتنی درخشاں وتابناک ہے کہ مزید کی کوئی حاجت نہیں[1] ـــــ دوسری طرف خاکِ دیوبند سے مولانا عبیداللہ سندھی ایسی متجدّدانہ مزاج رکھنے والی شخصیت ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں بھرپور مشاہدہ بھی کیا۔ اور جدید رجحانات کے زیرِ اثر ملت اسلامیہ کے لئے تمدّن ومعاشرت اور معیشت وسیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے استناد دیوبند کے موجود الوقت مقلدّانہ ماحول سے نہیں' بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے فلسفۂ ارتفاقات ہی سے مل سکتا تھا! ـــــ تاہم یہ مثالیں محض استثنائی ہیں اور ایک

---

[1] خود علامہ اقبال بھی جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے آئے گا' بہرحال اسی شاخ سے متعلق ہیں۔

انگریزی مثل[1] کے مطابق، ان سے وہ کلیہ مزید مستحکم ہوتا ہے۔ جو ہم نے بیان کیا تھا، یعنی یہ کہ علی گڑھ اور دیو بند کے مابین کم از کم بُعد المشرقین موجود ہے[2]۔

اس بُعد کا احساس بھی بالکل شروع ہی سے ہو گیا تھا اور اس فاصلے کو کم کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی ضرورت بھی بالکل ابتداء ہی سے محسوس کی جانے لگی تھی ـــــ چنانچہ ان کے مابین امتزاج اور ارتباط کی کوششوں کا سراغ بھی بالکل ابتداء ہی سے ملتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام ان کوششوں کا مظہرِ اوّل تھا ـــــ اور دہلی میں جمعیت الانصار اور جامعہ ملّیہ کا قیام مظہرِ ثانی۔ پھر ان ہی کوششوں کا ایک تیسرا مرکز جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بنا اور اس نے بھی جدید و قدیم کو قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

ندوہ کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ علی گڑھ کی کوکھ سے بر آمد ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم جو پہلے علی گڑھ کے پروفیسر شبلی تھے اور بعد میں ندوہ کے علامہ شبلی بنے، ابتداءً سرسید مرحوم کے رفقاء اور اعوان و انصار میں سے تھے، جو بعد میں ان سے بدظن اور ان کی تعلیمی سکیم سے غیر مطمئن ہو کر ان سے علیحدہ ہوئے۔ ہمیں یہاں ان اسباب سے کوئی بحث نہیں جن کی بناء پر یہ علیحدگی واقع ہوئی۔ ہمیں بحث قیامِ ندوہ کے صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ قدیم و جدید ـــــ اور تجدّد و جمود کے مابین ایک متوازن علمی و فکری راہ پیدا کرنے کی سعی کا سب سے پہلا اور ہر اعتبار سے اہم ترین مظہر ہے۔

لیکن ـــــ یہ ایک واقعہ ہے کہ ندوہ فکر و نظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گھوارہ اور تاریخ اسلامی کا

---

[1] EXCEPTIONS PROVE THE RULE!

[2] یہ بُعد صرف مذہبی تصوّرات اور دینی فکر کے میدان تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، اس بُعد سے ملّی و قومی سیاست بھی بری طرح متأثر ہوئی اور اس میدان میں بھی ان دونوں کے رخ بالکل متضاد سمتوں میں مڑ گئے۔

ایک دارالاشاعت بن کر رہ گیا۔ اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا ــــــ!

ایک جدید لیکن متوازن 'علم کلام' کی تدوین کی ضرورت کا احساس تو مولانا شبلی کو شدّت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی لئے پہلے انہوں نے "علم الکلام" میں قدیم علمِ کلام کی تاریخ مرتب کی اور پھر نیا علمِ کلام "الکلام" کے نام سے لکھنا شروع کیا ــــ لیکن ایک[1] تو وہ اس کی صرف ایک جلد لکھ کر رہ گئے' حالانکہ اس کی تکمیل ان کے پیش نظر سکیم کے مطابق تین جلدوں میں ہونی تھی[1] اور دوسرے[2] یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وہ وقت کے تقاضے کو بھی بالکل نہ سمجھ پائے۔ اور جو 'علم کلام' اس وقت حقیقتاً مطلوب تھا اس کے فروع کیا اصول بھی ان پر واضح نہ ہو سکے!

جن دو انتہاؤں کے مابین مولانا شبلی ایک متوازن راہ نکالنا چاہتے تھے ان کا تذکرہ خود ان کے الفاظ میں سنئے :۔

> "حال ہی میں علم کلام کے متعلق مصر' شام اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے: یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل و دلائل ہیں جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے[2] یا یہ کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملا دیا ہے[3] پہلا کورانہ تقلید

---

[1] غالباً اس لئے کہ اس پہلی ہی جلد پر جو مخالفت ہوئی اور کفر کے فتوے موصول ہوئے' وہی مولانا شبلی کے لئے بہت کافی تھے۔

[2] یہ صاف اشارہ ہے حلقۂ دیوبند کی نئی کلامی تصنیفات کی جانب جیسے مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کی "حجۃ الاسلام" !۔

[3] مراد ہے سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کا علم کلام۔

ہے اور دوسرا تقلیدی اجتہاد[1] " (علم الکلام، تمہید)

ان دونوں کو رد کر کے جس تیسرے علم کلام کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں 'جدید تعلیم یافتہ گروہ' کا نقطہ نظر مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"ہر طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے، لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہوگا' کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے' آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محض قیاسات اور مظنونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے اس لئے اس کے مقابلہ میں محض قیاساتِ عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا" ۔ (ایضاً)

لیکن کمالِ سادگی کے ساتھ اس رائے کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ :۔

"لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا اور جو حصہ اس وقت کار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ کسی شے کی صحت اور واقعیت زمانہ کی امتداد و انقلاب سے نہیں بدلتی۔ اس بناء پر مدت سے میرا ارادہ ہے کہ علم کلام کو قدیم اصول اور موجود مذاق کے موافق مرتب کیا جائے...... " (ایضاً)

چنانچہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یہی تھا کہ قدیم علم کلام کو نئے 'اسلوب' نئے پیرایۂ بیان اور نئے انداز میں گویا کہ نئے 'مذاق' کے مطابق پیش کر دیا۔

لیکن اصل مسئلے کے فہم کی کوتاہی میں مولانا شبلی غالباً بالکل معذور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے زمانے تک جدید فلسفے اور سائنس کا ادغام نہیں ہوا تھا۔ دوسرے[2] خود فلسفہ بھی ابھی صرف اسپنسر اور مل تک ہی پہنچا تھا۔ گویا کہ فکرِ جدید کا اصل چیلنج ابھی پوری طرح

---

[1] مولانا کا یہ طرز تعبیر یقیناً بہت قابل داد ہے۔

[2] بقول اکبر الہ آبادی مرحوم ؎

غزالی و رومی کی بھلا کون سُنے گا محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 'الکلام' کے مقدمے میں مولانا نے فلسفہ و سائنس کی موجود الوقت صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور فلسفۂ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ فلسفہ و مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفہء قدیمہ قیاسات اور ظنیات پر مبنی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ بر خلاف اس کے فلسفۂ جدیدہ تمامتر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے، اس لئے مذہب کسی طرح اس کے مقابلے میں جانبر نہیں ہو سکتا ـــ یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبعیات سب شامل تھا، لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے۔ جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا!"

لیکن افسوس کہ یورپ میں یہ "نہایت صحیح اصول" بس تھوڑی دیر ہی چل سکا اور جلد ہی اس کے بجائے وہ 'فطری اصول' پھر بروئے کار آگیا کہ علم ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اور اسے سائنس اور فلسفے کے دو جداگانہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یورپ کا بعد کا فلسفہ ان نظریات کی اساسات پر مرتب و مدوّن ہوا جو سائنس کے بعض شعبوں سے ابھرے جیسے مثلاً ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور فرائڈ کا نظریۂ جنس وغیرہ۔

الغرض، جدید دنیا کو جو نیا علم کلام فی الواقع مطلوب تھا اس کے تو اصول و اساسات کے بارے میں بھی مولانا شبلی صحیح تصور قائم نہ کر پائے تو اس کی تدوین کیا کرتے۔ رہا دوسرے معاملات میں علی گڑھ اور دیوبند کے مابین امتزاج تو اس کی بھی کوئی صورت ندوہ میں پیدا نہ ہو سکی ـــ اور مولانا شبلی کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

نے جب حلقۂ دیوبند کی ایک علمی و روحانی شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تو یہ بات بالکل ہی کھُل گئی کہ ندوہ کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی حیثیت بس ایک چھوٹی سی لہر کی ہے جو علی گڑھ کی عظیم رَو سے نکل کر بالآخر دیوبند کی دوسری بڑی رَو میں جا شامل ہوئی۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید سید ابوالحسن علی ندوی نے کچھ عرصہ اِدھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر اسی حلقۂ دیوبند کی ایک دوسری روحانی شخصیّت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہ اسی سنتِ سلیمانی کا 'اتباع' ہے۔ بہرحال اب ندوہ کی حیثیت دیوبند کے ایک ضمیمے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک توسیع (EXTENSION) کی 'اس کا مستقل جداگانہ وجود کوئی نہیں!

اس طرح ندوہ تو بہت جلد ختم ہو گیا اور مولانا شبلی جو درمیانی راہ نکالنا چاہتے تھے وہ اس کے ذریعے سے نہ نکل سکی۔ تاہم ان کی یہ خواہش بعض دوسری پگڈنڈیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصّفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل 'فلسفہ و کلام' شعر و ادب اور ملی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی و رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی شخصیّت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض دوسری صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو جاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہ راست ندوی تو نہیں ہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے ــــ اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں۔ مثلاً

ایک یہی کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں، مولانا شبلی کے بالکل برعکس ـــ جنہوں نے اپنی 'حنفیّت' کی شدت کے اظہار کے لئے "نعمانی" کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنالیا تھا، تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی ـــ لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہی بالکل زاہدِ خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضعداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا ـــ مولانا آزاد "ابوالکلام" تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور ادبیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی، مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا ـــ چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امام الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ آج تک بھی صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ـــ لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی، جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرز فکر اور مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرہ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا' مزاج کے افتاد کے فرق کی بناء پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۃ الفاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقّع ہے۔ پھر سورۃ الکہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں' بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظم قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبّرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سر نو مرتّب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو بالحال نامکمل مسودات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتہً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی ـــــ جیسا کہ ہم نے عرض کیا' آسمانِ شبلی کے ان "دو ٹوٹے ہوئے تاروں" سے بر صغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو سوتے پھوٹے ہیں جن کا تذکرہ صورت حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں' جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار یعنی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کو سنبھالا دوسری طرف دائرۂ حمیدیہ قائم کیا۔ تیسری طرف ۳۸ء میں ماہنامہ "الاصلاح" جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ وقس علی ہذا ـــــ لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھے کہ حکیم فراہیؒ کا یہ جانشین ابو الکلام کے معنوی خلیفہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "دعوت اسلامی" کی گھن گرج سے متاثر ہو کر' رخت سفر باندھ ان کی خدمت میں جا حاضر ہوا اور ایک آدھ نہیں سترہ سال ان کی شخصیت کے پیچ و خم میں الجھا رہا ـــــ تا آنکہ پورے سترہ سال اس دشت کی بادیہ پیمائی کے بعد' آج سے دس سال قبل[1]

---

[1] اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ۶۸ء میں لکھی گئی تھی!

جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ماضی بہت پیچھے رہ گیا۔ دائرۂ حمیدیہ اور فکرِ فراہیؒ کے تمام قدردان ہندوستان میں رہ گئے۔ یہاں یکہ و تنہا' نہ کوئی رفیق نہ ہمراہ' نہ اسباب نہ وسائل' الغرض ع

"جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا"

ان حالات میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح پھر "جگر لخت لخت" کو جمع کیا اور از سرنو اپنے کام کی ابتداء کی' واقعہ یہ ہے کہ یہ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کی جواں ہمتی کی دلیل ہے ـــــ بہرحال 'الاصلاح' کی جگہ 'میثاق' کا اجراء ہوا جو قلتِ اعوان و انصار کی بناء پر کچھ عرصہ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی مانند چلا اور پھر بند ہو گیا ـــــ "حلقہ تدبرِ قرآن" قائم ہوا جس کے ذریعے چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ نہایت کامیابی سے چلنے کے بعد ان نوجوانوں کے ادھر ادھر منتشر ہو جانے کی بناء پر اس کا کام بھی بند ہو گیا ـــــ تا آنکہ آج سے ڈھائی سال قبل راقم الحروف' جس نے خود مولانا مودودی کی "تحریک اسلامی" ہی کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور ان ہی کے واسطے سے مولانا اصلاحی سے متعارف ہوا تھا' لاہور منتقل ہوا اور اسے اللہ نے مولانا کے ان کاموں میں تعاون کی توفیق و سعادت بخشی' تو اُس تعؐ کے فضل و کرم سے 'میثاق' بھی از سرنو جاری ہوا اور بحمد اللہ تاحال جاری ہے' "تدبرِ قرآن" کی جلد اول بھی شائع ہوئی اور مولانا کے درسِ قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے۔

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہ راست تلمذّ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے جو قلبی رابطہ اور کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے۔ اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمرِ دراز اور صحت و فراغت عطا فرمائے' تاکہ وہ اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسل کو منتقل کر سکیں' ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں اور راقم کو بھی اس نیک کام

میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین [1]

بہرحال فکر فراہیؒ اور سلسلہ تدبّرِ قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کمیّت اور حلقہ اثر کے اعتبار سے تو فی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے، خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی خالصتہً قرآن حکیم پر ہے اور اس میں سارا استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے اور تدبّرِ قرآن کا جو خاص اسلوب و نہج اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاءاللہ 'حکمتِ قرآنی' کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکر انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی ـــــ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید اور حقیقتِ تقویٰ میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاح معروف تو 'علم کلام' نہیں، لیکن خالص 'قرآنی علم کلام' ضرور ہے اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصتہً قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک 'نئے علمِ کلام' کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اگرچہ کبھی صراحتہً کیا کنایتہً بھی یہ تسلیم نہیں کیا ـــــ اور ان کی انانیت پسند اور خود پرست (EGO - CENTRIC) شخصیت سے اس کی توقع بھی عبث ہے ـــــ کہ انہوں نے اپنی تحریک کے اصول و مبادی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے اخذ کئے ہیں [2] ـــــ تاہم واقعہ یہی ہے کہ ۳۸ ـ ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ جب مسلمانانِ ہند کی قومی و

---

[1] افسوس کہ اس تحریر کی تسوید کے کچھ عرصہ بعد سے راقم الحروف کے تعلقات مولانا موصوف سے کشیدہ ہونے شروع ہوئے۔ اور 'تدبّرِ قرآن' کی جلد چہارم میں جب مولانا نے حدِّ زنا کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تب سے تو تعلق بالکل ہی منقطع ہو گیا۔ اس پورے معاملے کی تفصیل راقم نے اپنی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن: منظر و پس منظر" میں درج کر دی ہے!

[2] اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے 'پختہ' واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ملّی سیاست کاایک رخ متعین ہو گیااور اس کی قیادت و سیادت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکاتو انہوں نے کسی 'دوسری راہ' پر سوچنا شروع کیااور اس کے لئے انہیں سارا پکاپکا یا اور بالکل تیار مواد مولانا ابو الکلام آزاد سے مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کی جگہ خود سنبھالی' ان کی وضع کردہ اصطلاح حکومتِ الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنایا (جس کی مزید تشریح خیری برادران کر چکے تھے) ان کی 'حزب اللہ' کے نقشے پر اپنی 'جماعت اسلامی' قائم کر دی اور اپنی 'تحریک اسلامی' کو انہی خطوط پر شروع کر دیا جو مولانا آزاد نے متعین کیے تھے لیکن جن پر وہ خود اپنی بعض کمزوریوں یا کچھ موانع کے باعث آگے نہ چل سکے تھے' یہی وجہ ہے کہ مولانا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کیاجاسکتاہے کہ انہوں نے (۱) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاپردازی کی بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا۔ (۲) نہ ابو الکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصوّرِ حکومت الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکرِ خیر کیا۔ (۳) اور نہ ہی علامہ اقبال کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکنّ ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں" ! پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعوئٔ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و ساز گار ہے...... حتیٰ کہ جب علاّمہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تب بھی مدیر 'ترجمان القرآن' نے کوئی کلمۂ خیر—یا کلمۂ تعزیت اپنے مؤقر جریدے میں شائع نہ فرمایا اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا "میں اس وقت حالتِ جہاد میں ہوں اور میدانِ قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے"۔

چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چودھری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا "ع کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"۔

مودودی اگرچہ ایک بہت بڑے مصنف اور مؤلف ہیں اور بسیار نویسی میں ان کے مدمقابل صرف دو غلام احمد ہی ہیں[1] ـــــ تاہم دین و مذہب کے میدان میں ان کا اصل مقام ابوالکلام مرحوم ہی کی طرح داعی کا ہے نہ کہ مفکر کا ـــ بایں ہمہ چونکہ ان کا وسیع و عریض لٹریچر برصغیر کے طول و عرض میں بھی پھیلا ہے اور مشرق وسطیٰ میں بھی' لہٰذا ملت اسلامیہ کی جدید مذہبی فکر کے اس جائزے میں ان کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے!

مودودی صاحب خود بھی اس امر کے مدعی ہیں اور ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ وہ "بیچ کی راس" کے آدمی ہیں۔ یعنی انہوں نے علی گڑھ کی پیداکردہ متجدّدانہ ذہنیت اور دیوبند کے قدامت پرستانہ مزاج کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے اور گویا کہ قدیم و جدید کو بہم کر دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ اس اعتبار سے وزنی بھی ہے کہ ان کی دینی دعوت اور ان کا مذہبی فکر دونوں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلے ہیں اور نہ صرف ملت اسلامیہ ہندو پاک بلکہ مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کی نوجوان نسل کا بھی ایک خاصہ قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر آیا ہے۔ پھر یہ بھی ان کے خود "بیچ کی راس" کے آدمی ہونے ہی کا ثمرہ تھا کہ ابتداءً برصغیر کے تمام درمیانی مکاتب فکر کے علمبرداران کی جانب کھنچ آئے[2] ـــــ چنانچہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا' ایک جانب مولانا فراہیؒ کے جانشین مولانا اصلاحی اپنے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس آ گئے۔ دوسری طرف مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے دونوں اہم شاگرد یعنی مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی

---

[1] یعنی ایک آنجہانی غلام احمد قادیانی اور دوسرے ایں جہانی غلام احمد پرویز!
(اس عرصہ کے دوران پرویز صاحب بھی اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ چکے ہیں!)

[2] یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سکہ بند مذہبی حلقوں میں سے مولانا مودودی کی طرف صرف اس طبقہ اہل حدیث کے لوگ آئے جو ایک تو غیر مقلّد ہونے کے باعث ویسے ہی 'آزاد' ہوتے ہیں' دوسرے یہ واقعہ ہے کہ اس طبقے میں خدمت و نصرتِ دین کا داعیہ ہمیشہ سے اتنا شدید رہا ہے کہ یہ ہر نئی دعوت پر اس امید میں والہانہ لپکتے ہیں کہ شاید اسی کے ذریعے اسلام کی 'غربت' ختم ہو جائے اور وہ خدا کے یہاں اسلام کے اس دورِ غربت میں اس کے ہمدرد و مونس و غمخوار شمار ہو جائیں!

ندوی بھی ان کے گرد جمع ہوگئے۔۔۔ پھر یہ بھی ان کے علی گڑھ اور دیو بند کے مابین کی شخصیت ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایک جانب حلقہ دیو بند سے ایک بے تاب روح' مولانا محمد منظور نعمانی کی صورت میں ان کی طرف کھنچ آئی اور دوسری طرف سلسلۂ سر سیّد سے بھی مولانا عبد الجبار غازی (پرنسپل اینگلو عربک ہائی سکول دہلی) ایسے لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔۔۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا مودودی اس شیرازے کو مجتمع نہ رکھ سکے اور کوئی جلد اور کوئی بدیر بدظن یا غیر مطمئن ہو کر ان سے کٹ گیا، تاہم چونکہ ان میں تنظیمی صلاحیت اور محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے کا مادّہ ابتداء ہی سے موجود تھا، وہ اس ساری 'آمدورفت' کے علی الرّغم ایک مذہبی فرقے کی حد تک مضبوط جماعت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، جس میں چوٹی کے نہ سہی درمیانی سطح کے لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مدرسوں اور دار العلوموں دونوں سے ہی فارغ التحصیل شامل ہیں۔

مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی کہاں اور کس مؤقف سے شروع ہوئی اور پھر وہ کن کن مراحل سے گزر کر بالآخر کہاں پہنچی اور اب "عشق بلاخیز" کا یہ "قافلۂ سخت جان" کس وادی اور کس منزل میں ہے' یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے' جس پر ہم نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصل بحث کی ہے۔ یہاں اصل گفتگو ان کی تحریک سے نہیں بلکہ ان کے 'فکر' سے ہے۔۔۔ اگرچہ یہاں اس اعتراف کا اعادہ کئے بغیر گزرا نہیں جا رہا کہ راقم الحروف نے خود بھی شعور کی آنکھ اسی تحریک کی گود میں کھولی اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ اسی کے طفیل پایا۔۔۔!!

فکر۔۔۔ کے میدان میں مولانا مودودی نے ابتداء ہی سے یہ 'حکمتِ عملی' برتی کہ فلسفہ اور علم کلام کے مشکل موضوعات سے کامل اجتناب کیا۔ حتیٰ کہ عقائد کے باب میں بھی ہمیشہ نہایت اجمال واختصار کے ساتھ بات کی اور جتنی کی اس میں بھی زیادہ تر ان اعتقادات کو بیان (NARRATE) کرنے پر اکتفاء کیا جو امت کے سوادِ اعظم کے یہاں معروف و مقبول ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو الٰہیات و مابعد الطبعیات سے بحث کی' نہ جدید فلسفیانہ رجحانات سے تعرض کیا' حتیٰ کہ ان گمراہ کن نظریات سے بھی براہ راست بحث و گفتگو سے

احتراز کیا جو جدید سائنس کے مختلف شعبوں سے ابھرے ہیں[1] ــــــــ گویا کہ علم کلام کی اصل سنگلاخ وادی میں انہوں نے سرے سے قدم ہی نہیں رکھا۔

اس کے برعکس انہوں نے عمرانیاتِ اسلام کو اپنا اصل موضوع بنایا اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی تمدن و اخلاق' معاشرت و معیشت اور ریاست و سیاست کے باب میں جدید نظریات جن اصطلاحات میں اور جس اسلوب و انداز سے مرتب و مدّون ہوئے ہیں انہی کو استعمال کر کے انہوں نے "اسلامی نظامِ زندگی" کا ایک مربوط و منضبط تصوّر پیش کرنے کی کوشش کی ــــ جس میں وہ بلاشبہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ــــ اس اعتبار سے انہیں زیادہ سے زیادہ ایک عمرانی مفکر (SOCIAL THINKER) قرار دیا جاسکتا ہے۔ گویا کہ ان کی اوّلین' نمایاں ترین اور بنیادی و اساسی حیثیت تو داعی کی ہے (اور اس پہلو سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا معنوی تسلسل ہیں) ۔ ثانوی حیثیت میں انہیں اسلام کا ایک جدید عمرانی مفکر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا حکمت عملی سے مودودی صاحب کو فائدے بھی بہت سے پہنچے۔ مثلاً ایک یہی کہ اعتقادی و کلامی بحثوں سے احتراز کی بناء پر ایک طویل عرصے تک وہ مذہبی طبقات کی مخالفت سے بچے رہے اور اس میدان میں قدم رکھتے ہی تکفیر و تفسیق کے جن فتووں کا سامنا ناگزیر ہوتا ہے ان سے محفوظ رہے ــــ دوسرے یہ کہ ان کا یہ اوسط درجے کا فکر قوم کے درمیانی و متوسط طبقے میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ بہت سے نوجوان "اسلامی نظام حیات" کے اس تصوّر کو قبول کر کے اس کے 'قیام' کی عملی جدوجہد کے لئے آمادہ ہوگئے ــــ گویا ان کی 'تحریک اسلامی' کے لئے راہ ہموار ہوگئی ــــ لیکن اس کے بہت سے مضر عواقب بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کا اعتقادی و تعبدّی پہلو بالکل دب کر رہ گیا اور اسلام کی بس یہی ایک حیثیت نگاہوں کے سامنے رہ گئی کہ وہ ایک "نظام زندگی" ہے۔ پھر چونکہ عمرانیات کے مختلف شعبوں میں سے بھی مودودی صاحب کا اصل میدان "سیاسیات" کا

---

[1] ان نظریات (مثلاً ڈارون کا نظریۂ ارتقاء) پر مولانا کی تنقید زیادہ سے زیادہ کچھ پھبتیاں کسنے تک محدود ہے اور وہ بھی صرف "رسائل و مسائل" ایسی کتابوں میں۔

ہے اور اسلام کے نظام زندگی میں بھی ان کی اصل نگاہ اس کے نظریۂ ریاست وسیاست پر ہے ، لہٰذا پورے دین ومذہب کی انہوں نے ایک خالص سیاسی تعبیر کر ڈالی اور دین کا اصل جوہر یعنی عبد و معبود کا باہمی ربط و تعلق بالکل نظر انداز ہو گیا۔[1] یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں میں سے اکثر وبیشتر کے معاملے میں یہ صورت حال نظر آتی ہے کہ وہ مذہب کے بنیادی لوازم سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ نماز روزے تک کے پابند نہیں رہتے۔ گویا کہ ان کا دین ومذہب کے ساتھ کُل لگاؤ تحریکِ اسلامی ہی کی بنیاد پر قائم تھا جو اس سے **انقطاع** کے ساتھ ہی منہدم ہو گیا۔ دوسرا اور ہماری اس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم تر ، نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ان کے زیر اثر نوجوانوں میں سے جنہیں بعد میں باہر کی دنیا سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ اپنے ملک اور اس کے بھی خالص اپنی تحریک کے محدود حلقے سے باہر نکل کر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پہنچتے ہیں اور وہاں مغرب کے اصل فکر سے براہ راست ان کا سامنا ہوتا ہے تو ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں[2] کہ ان کا سابق اسلامی فکر ریت کے کچے گھروندوں کی طرح جواب دے جاتا ہے اور وہ ریب و تشکک کا شکار ہو کر بعض اوقات بے دینی والحاد تک جا پہنچتے ہیں ــــ اسی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ چونکہ یہ 'مذہبی فکر' کسی پختہ اور محکم فلسفیانہ اساس پر قائم نہیں ، لہٰذا اس میں نمو اور ترقی کی صلاحیتیں بھی مفقود ہیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے حلقے کے جرائد کو دیکھ لیجئے یا نئی مطبوعات کو ...... حتیٰ کہ ان کے قائم کردہ ریسرچ کے اداروں تک سے جو چیزیں شائع ہو رہی ہیں ان سب میں بس دو ہی چیزیں نظر آئیں گی یا تو "فرموداتِ ماؤزے تنگ" کی طرح ' فرموداتِ مودودی ' کی تشریح و توضیح ــــ یا پھر خالص جماعتی اور تحریکی پروپیگنڈا ــــ اس میں اگر کوئی اضافہ پچھلے چند سالوں سے ہوا ہے تو صرف یہ کہ الاخوان المسلمون کے

---

[1] اس موضوع پر اختصار کے ساتھ راقم نے اپنی تحریر "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" میں بحث کی ہے

[2] اور یہ صورت عموماً نسبتاً ذہین تر نوجوانوں کے ساتھ پیش آتی ہے اور ' جماعت اسلامی ' سے قریب کا تعلق رکھنے والے لوگوں کو بخوبی علم ہے کہ اس طرح کے حادثوں (CASUALTIES) کی مثالیں بہت عام ہیں۔

اہل قلم کی نگارشات اوران کی تحریک اور شرق اوسط کے عام حالات پر معلوماتی مضامین بھی مل جاتے ہیں...... اور بس!

الغرض...... قدیم وجدید کا جو امتزاج سیدابوالاعلیٰ مودودی اوران کی جماعت کے ذریعے ہوا ہے واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت سطحی ہے اوراس نئے پیوند کی اپنی مستقل جڑ کوئی نہیں! لہٰذا نہ صرف یہ کہ اس کے نشوونما اور بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا کوئی امکان نہیں بلکہ اس کا بقاءووجود بھی بہت مشتبہ ہے!

اس اعتبار سے ہمارے نزدیک برصغیر کی اہم ترین شخصیّت علامہ اقبال کی ہے اور علوم وفنونِ جدیدہ کی روشنی میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے ضمن میں واقعی اور حقیقی قدروقیمت رکھنے والا کچھ کام اگر کسی نے کیا ہے تووہ تنہا ان ہی کی ذات ہے۔ چنانچہ اعلیٰ ریاضی وطبعیات اور اعلیٰ نفسیات کی بنیاد پر انہوں نے مذہب کی بعض اساسات کا اثبات جس طریق پر کیا ہے اور خوگرانِ تجربہ وشہود کے سامنے مذہب کو بھی ایک واقعی اور حقیقی تجربے کی حیثیت سے جس طرح پیش کیا ہے وہ فکرِ جدید کا رشتہ ایمان کے ساتھ جوڑنے کی ایک اہم کوشش ہے جو بالکل ابتدائی اور بنیادی ہونے کے باوجود اور اپنی بعض خامیوں اور غلطیوں کے علی الرّغم نہایت وقیع اور قابل قدر ہے۔

☆ ☆ ☆

ضمیمہ جات

ضمیمہ اوّل

مکتوب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اس سلسلۂ مضامین کی آخری کڑی ـــــ یعنی "علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں" کے عنوان سے جو تحریر ابھی آپ نے مطالعہ فرمائی، وہ 'میثاق' بابت نومبر ۶۸ء میں بطور "تذکرہ و تبصرہ" شائع ہوئی تھی اور اس پر ایک حد درجہ تحسین آمیز خط مولانا عبدالماجد دریابادی کی جانب سے موصول ہوا تھا!

لکھنے اور بولنے والوں کو اپنی تحریر و تقریر پر داد و بیداد دونوں ہی سے سابقہ رہتا ہے اور عام قاعدہ یہی ہے کہ ان کا زیادہ ذکر نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً اپنی تعریف و تحسین کو نقل کرنا تو بہت ہی معیوب ہے۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی کا وہ خط 'میثاق' کی دسمبر ۶۸ء کے کور پر لفظ بلفظ شائع کر دیا گیا تھا ـــــ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ بلاشبہ مولانا موصوف خود اپنی ذات کے اعتبار سے برّصغیر ہند و پاک کے دورِ حاضر کے علمی، ادبی، فکری اور صحافتی حلقے کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے تھے، اور یہ بات بجائے خود کچھ کم اہم نہیں لیکن ـــــ اُن کے خط کی اشاعت کا اصل سبب یہ تھا کہ زیرِ تذکرہ تحریر میں مسلمانانِ ہند کی جس بزمِ ملّی و دینی کے اعاظم رجال کا 'تذکرہ' اور ان کی علمی و فکری تحریکوں پر 'تبصرہ' کیا گیا تھا مولانا موصوفؒ صرف یہ کہ خود اس بزم کے شرکاء میں سے تھے بلکہ اس تحریر کی اشاعت کے وقت وہی اس قافلۂ ملّی کی آخری بقیہ حیات شخصیت تھے۔ گویا اُن رجال کے ضمن میں مولانا کی رائے ایک چشم دید گواہ کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے ـــــ افسوس کہ اب مولانا موصوف بھی ؏ "اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!" کا مصداق بن چکے، فیغفر اللہ لنا و لہ وادخلہ فی اعلیٰ علیّین۔ 'میثاق'، دسمبر ۶۸ء کے کور کا عکس سامنے کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں!

(اسرار احمد)

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 15 | DECEMBER 1968 | No. 12

"تحسین ناشناس !"

مکتوب مولانا عبدالماجد دریابادی

بنام

مدیر میثاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

'صدق جدید'
دریا باد ضلع بارہ بنکی

مورخہ : ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء

صاحب من ، السلام علیکم

میثاق ، بابت نومبر پیش نظر ہے : صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۳ ،
تحسین ناشناش کا ڈر نہ ھوتا تو دل نے تو بے اختیار یہ صلاح دی کہ اس ساری عبارت پر ایک خوب بڑا سا صاد

ص

کھینچ کر بھیج دیجئے ۔ سبحان اللہ ، ما شاء اللہ ۔ ع
'دل نے یہ جانا کہ یہ سب کچھ ھی میرے دل میں تھا !'

حیرت ھوگئی ، کہ شبلی ، فراھی ، ابوالکلام ، تینوں کی یہ نباضی ، بعد زمانی و بعد مکانی دونوں کے باوجود ، اتنی صحیح کیونکر کرلی ! ع
' در حیر تم کہ بادہ فروش از کجا شنید ! '

ڈاکٹر رفیع الدین کا بھی مقالہ اس نمبر میں بڑا قابل داد ہے ۔

والسلام
دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد"